اصحاب کے قلم سے مقدمے، دیباچے اور پیش لفظ وغیرہ ہیں، مگر اتنے شاعرون کے کلام کی سطح کا یکسان ہونا دشوار ہے، اس لئے ان نظمون میں ناہمواری بہت ہے، مگر بیشتر نظمین اچھی ہین، اور اس اظہار عقیدت مین ایک خاص جدت ہے،

حیات جمال الدین افغانی } از جناب رضا ہمدانی تقطیع اوسط ضخامت ۱۱۹ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت :- عہ/ پتہ :- چوک انار کلی گوشۂ ادب لاہور،

سید جمال الدین افغانی کے متعلق اردو مین کافی لٹریچر موجود ہے، اور بعض اچھی کتابین بھی لکھی جا چکی ہین، مصنف نے بھی اُن کے حالات مین یہ مختصر کتاب تحریر کی ہے، مگر اس مین سید صاحب مغفور کے وطن کی تحقیقات کے علاوہ کوئی نیا اضافہ نہیں ہے، مصنف نے صرف اہم "طویل واقعات" کا خلاصہ کر دیا ہے،

رسالہ حاصور و باسور، از جناب حکیم محمد کبیر الدین صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۳۶ صفحات کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت :- عہ/، دفتر المسیح بازار نور الامراء حیدر آباد دکن،

مؤلف رسالہ نامور اور حاذق طبیب ہین، اس رسالہ مین انھون نے قبض و بواسیر کے اسباب و علامات، اُن کے اقسام اور اُن سے پیدا شدہ امراض و عوارض کے علاج، تدبیرون، دواؤن اور پرہیز کی بڑی تفصیل تحریر کی ہے، جو اس مرض مین مبتلا مریضون اور اطبار کے مطالعہ کے لائق ہے،

"م"

جلد ۶۹　ماہ جمادی الاول ۱۳۷۱ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۵۲ء　عدد ۲

مضامین

شذرات

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ ہندوستان اور پاکستان کے کئی اصحابِ علم وقلم نے وفات پائی، ان مین سب سے ممتاز شخصیت مولانا اکرام اللہ خان ندوی کی تھی، مرحوم دار العلوم ندوۃ العلماء کے دور اوّل کی پیداوار اپنی علمی وتصنیفی قابلیت کے اعتبار سے ممتاز حیثیت کے مالک تھے، ان کا وطن شاہجہان پور تھا، اور تعلیم ندوۃ العلماء مین حاصل کی تھی، انھون نے مولانا شبلی مرحوم سے باقاعدہ درس تو نہین لیا تھا، مگر ان کی صحبت کے فیض یافتہ تھے، تعلیم سے فراغت کے بعد کئی سال تک دار العلوم کے مشہور رسالہ الندوہ کے اڈیٹر رہے، اور کچھ دنون تک ندوہ کے اہتمام کے فرایض بھی انجام دیئے تھے،

غالباً ۱۹۲۰ء مین نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی مرحوم نے اُن کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اسسٹنٹ سکرٹری کی حیثیت سے علی گڈھ بلالیا تھا، جس سے وہ آخر عمر تک وابستہ رہے، مولانا شروانی مرحوم کا قیام امور مذہبی کی صدارت کے سلسلہ مین حیدرآباد مین رہتا تھا، اس لئے کانفرنس کا سارا کام مولانا اکرام اللہ خان کے ہاتھون مین تھا، جس کو انھون نے بڑی خوش اسلوبی سے چلایا، کانفرنس گزٹ کی اڈیٹری کے فرایض بھی وہی انجام دیتے رہے، اور کانفرنس کی تجویزین اور سالانہ اجلاسون کی رپورٹین وغیرہ بھی وہی مرتب کرتے تھے، اور ۱۹۲۰ء سے لیکر ۱۹۵۰ء تک کامل ۳۰ سال تک کانفرنس انہی کی ذات سے عبارت تھی مرحوم کو ندوۃ العلماء سے بھی گہرا تعلق تھا، اور وہ ہر زمانہ مین اسکی خدمت انجام دیتے رہے،

بڑا نہایت متین، خاموش، کم آمیز، اور دنیاوی جاہ وشہرت سے بے نیاز تھے، اسی لئے علمی دنیا مین وہ شہرت حاصل نہ کر سکے جس کے وہ حقیقۃً مستحق تھے، مگر مسلمانون کی خاموش مفید علمی وتعلیمی خدمات انجام دین، انھون نے اور کانفرنس گزٹ مین انھون نے سیکڑون علمی، تعلیمی، اور اصلاحی مضامین لکھے جن کا مجموعہ کئی جلدون مین آ گیا اُن کی مستقل قلمی یادگار نواب وقار الملک کی سوانحمری وقار حیات ہے، جو تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے، وفات کے وقت ۶۴، ۶۵ سال کی عمر رہی ہو گی، مرحوم کی وفات سے نہ صرف ندوہ کی جماعت بلکہ ہندوستان کے علمی حلقہ مین ایک ممتاز جگہ خالی ہو گئی، اللہ تعالیٰ اس خادم علم کو اپنی رحمت سے سرفراز فرمائے،

دوسرا حادثہ ملا رموزی کی وفات کا ہے، ان کا اصل نام احمد صدیق تھا، مگر ادبی دنیا مین ملا رموزی کے نام سے مشہور تھے، بھوپال وطن تھا، اور مدرسہ الٰہیات کانپور مین تعلیم پائی تھی، مگر حصول تعلیم کے بعد خالص ادبی زندگی اختیار کی، وہ اردو مین ایک خاص مزاحیہ طرز کے موجد تھے، جس کا نام انھون نے گلابی اردو رکھا تھا، اور جوانی کے ساتھ ختم ہو گیا، ایک زمانہ مین یہ طرز بہت مقبول تھا، مگر ادھر چند برسون سے اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا، اور مرحوم کے قلم مین وہ تازگی اور جولانی باقی نہین رہ گئی تھی، وفات کے وقت پچاس سے کچھ اوپر عمر رہی ہو گی، جو علمی دنیا کے لئے گویا شباب کی عمر ہے، مگر اتنی ہی عمر مین مرحوم نے شہرت وقبول کے سارے مدارج طے کر لئے تھے، اور بالآخر گذشتہ مہینہ زندگی کا آخری مرحلہ بھی طے ہو گیا، والبقاء للہ وحدہٗ،

اسی مہینہ مین پاکستان کے ایک خط سے یہ افسوسناک اطلاع ملی کہ جنوری کے آخر عشرہ مین مولانا حیدر زمان صدیقی نے وفات پائی، مرحوم سے صرف علمی مراسلت رہتی تھی، اس لئے ان کے ذاتی حالات کم معلوم ہین، ایک زمانہ مین اُن کا قیام ٹھاکر نکوٹ مین تھا، مگر ہندوستان کی تقسیم کے بعد سے ہری پور ضلع ہزارہ مین منتقل ہو گئے تھے، مرحوم بڑی صلاحیتون کے مالک تھے، اور اپنی علمی وتصنیفی زندگی کے ابتدائی ہی دَور مین ایک خاص حلقہ مین اچھی خاصی

شہرت حاصل کرلی تھی، اسلامی تعلیمات کی روشنی مین جدید دور کے سیاسی و معاشی مشکلات کا حل اُن کا خاص موضوع تھا، اس موضوع پر وہ معارف اور دوسرے رسالون مین برابر مضامین لکھتے رہتے تھے، اور اسلامی مسائل کے جدید معترضین کے برخلاف ان کا قلم بڑی حد تک محتاط واقع ہوا تھا، متفرق مضامین کے علاوہ مستقل تصانیف مین غالباً صرف ایک کتاب اسلام کا نظریہ سیاست انکی قلمی یادگار رہی، مرحوم کی ذات سے بڑی توقعات وابستہ تھین، لیکن افسوس موت نے ان کو پوری ہونے کا موقع نہین دیا، اللہ تعالیٰ اس خادم دین کو اپنی مغفرت سے نوازے،

معارف شروع سے اب تک ایک روش پر قائم ہی، اور مخالف حالات مین بھی اس نے اپنی ظاہری اور معنوی خصوصیات مین فرق نہین آنے دیا، اس لئے پہلے کے مقابلہ مین اب اس کے مصارف چوگنے ہوگئے ہین، مگر قیمت مین کل ایک روپیہ کا اضافہ کیا گیا ہی، جو مصارف کے مقابلہ مین کچھ بھی نہین ہی، اس لئے وہ کئی سال سے خسارہ سے چل رہا ہو، اسپر ڈیڑھ دو سال سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سکہ کے تبادلہ کی دشواریون کی وجہ سے پاکستان کے خریدارون کی تعداد بہت گھٹ گئی ہے، جس سے خسارہ اور زیادہ بڑھ گیا ہی،

ان حالات مین دوسرا رسالہ مشکل سے جاری رہ سکتا تھا یا کم از کم ظاہری حیثیت قائم نہین رکھ سکتا تھا، مگر معارف انشاء اللہ ہر حال مین ایک شان سے علم و ادب کی خدمت مین مشغول رہے گا، لیکن اس بارہ مین اردو زبان اور اسلامی علوم و فنون کے بہی خواہون کو بھی اپنے فرائض محسوس کرنے چاہئین عام طور سے لوگون پر چھ روپے سالانہ بھی گران گذرتے ہین، ایسی حالت مین قیمت مین اضافہ کا کوئی سوال نہین ہی، مگر اس کمی کی تلافی اشاعت سے ہوسکتی ہو، اگر اس کے خریدارون کی تعداد مین معقول اضافہ ہو جائے، تو خسارہ آسانی سے پورا ہو سکتا ہی، اگر صرف دار المصنفین اور معارف کے قدردانون کا حلقہ تھوڑی سی توجہ سے کام لے تو یہ کام کچھ دشوار نہین ہی، اور اگر ہندوستان اور پاکستان کے مسلمان ملکر بھی معارف جیسے رسالہ کو زندہ نہین رکھ سکتے تو پھر انھین اردو زبان اسلامی علوم و فنون اور اسلامی کلچر سے زبانی ہمدردی کا کیا حق ہے،

مقالات

نقوشِ سُلیمانی طبع دوم کا مقدمہ

اُردُو کا ماضی، حال اور مستقبل

از

مولانا سید سُلیمان ندوی

نقوشِ سلیمانی

آج سے بارہ برس پہلے ۱۹۳۹ء مین جب اردو ہندی، اور ہندوستانی کی بحثین غیر منقسم ہندوستان مین جاری تھین، اور زبان کے معاملہ مین کسی سمجھوتہ پر پہنچنے کے لئے ملک کے خادم بے چین تھے، خاکسار نے اپنی زبان اور ادب اردو کے متعلق ۱۹۱۵ء سے لےکر اس وقت تک جو تقریرین کی تھین، یا تحریرین لکھی تھین، ان کو ایک کتاب کی صورت مین جمع کر دینا مناسب سمجھا، اور اس مجموعہ کا نام نقوش سلیمانی رکھا، یہ مجموعہ چھپا، اور توقع سے زیادہ مقبول ہوا، اور کئی یونیورسٹیون کے نصاب مین داخل ہوا، کیونکہ اُس کے نقوش کے آئینہ مین اردو کا ماضی، حال، اور مستقبل پوری طرح نظر آتا تھا، ایک ہزار نسخے چھپے تھے، اور وہ چند سال مین ختم ہوگئے، اور دوبارہ اُن کے چھپنے کی نوبت نہین آئی، احباب اور شائقین کے تقاضے جاری تھے، اسی اثنا مین تین سال ہوئے کہ لاہور سے میرے لائق دوست پروفیسر سید عبد اللہ صاحب (پنجاب یونیورسٹی) نے لکھا کہ نقوش سلیمانی یونیورسٹی کے نصاب مین داخل ہے، اور اُس کے نسخے بازار مین نہین ملتے، لاہور کے کسی پبلشر سے اُس کے چھپوانے کی تدبیر کیجئے، یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان کی تقسیم نے صورتِ حال

دی تھی، اور نئے نقشے کے مطابق سمجھ مین نہین آتا تھا، کہ کون کیا کرے اور کہان کرے، بہرحال تقدیر کی کایا پلٹ نے جب مجھے بھوپال سے نکال کر جون ۱۹۵۰ء مین کراچی پہنچایا، اور غور و فکر کے بعد نئی زندگی کا پھر سے نقشہ بنایا، تو اپنی گذشتہ کتابون کو یہان چھاپنے اور چھپوانے کا خیال آیا، تو دوسری کتابون کے ساتھ نقوش سلیمانی کے بھی دوبارہ چھپوانے کی تجویز ذہن مین آئی، اور بحمد اللہ کہ اب وہ چھپکر تیار ہے،

نقوش کا موجودہ نسخہ

نقوش کا موجودہ نسخہ گذشتہ نسخہ کا نقش ثانی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ پہلا نسخہ تین بابون پر منقسم تھا، خطبات، مقالات، اور مقدمات، یہ نسخہ صرف دو بابون پر مشتمل ہے، خطبات اور مقالات، مقدمات کا باب اس لئے الگ کر لیا گیا ہے کہ مقدمات کی ایک الگ جلد زیر ترتیب ہے، پہلے باب مین ایک نیا خطبہ جو پہلے ایڈیشن کے بعد ایجوکیشنل کانفرنس کلکتہ مین پڑھا گیا تھا، بڑھا دیا گیا ہے،

نقوش سلیمانی کی اہمیت کے بعض وجوہ

نقوش سلیمانی یون تو چند پرانے ادبی خطبون اور تحریرون کا مجموعہ ہے، مگر میرے خیال مین اس کے اندر اہمیت کی چند خاص باتین ہین،

۱- یہ پہلی کتاب ہے جس مین سب سے پہلے اردو کے مولد کی تعیین و تشخیص کے باب مین سندھ اور ملتان کی نشاندہی کی گئی، اور یہ اشارات سب سے پہلے ۱۹۱۵ء کے اجلاس اردو کے خطبہ صدارت مین کئے گئے، (ص ۴ و ۵) پھر بعد کے خطبون اور مقالون مین ان پر مزید روشنی ڈالی جاتی رہی (ص ۳۱، ص ۴۴) شروع شروع مین تو اس پر بعضون نے کم سمجھی سے طعن و طنز بھی کئے، مگر تاریخ نے ۱۳۶۶ھ (۱۹۴۷ء) مین اپنے کو دہرا کر ماضی کی حقیقت حال کے پردہ مین لاکر سب کے سامنے پیش کر دی، یہان تک کہ ایک سندھی محقق پیر حسام الدین صاحب نے اس موضوع پر ایک محققانہ مقالہ لکھکر انجمن ترقی اردو مین ابھی پیش کیا ہے،

فارسی کی سیاسی تاریخی کتابون مین اردو کا سب سے پہلا فقرہ جو اب تک ملا ہے، وہ فیروز شاہ تغلق کے عہد کا ہے، محمد شاہ تغلق نے جب ۷۵۲ھ مین ٹھٹھ پر حملہ کیا، اور اسکی موت سے اس کا یہ حملہ ناکام رہا، اور اس کے بعد ۷۶۲ھ مین فیروز شاہ نے دوسرا حملہ کیا، اور وہ بھی ناکام واپس گیا، تو ٹھٹھ والون نے کہا،

"برکت شیخ تھیا، ایک موا اور ایک تھا" (شمس سراج ص ۲۳۱)

اس فقرہ کا اخیر لفظ شمس سراج عفیف کی مطبوعہ تاریخ مین "تھا"، اور "نہا" دونون پڑھا جا سکتا ہے، مگر صحیح لفظ مفہوم نہین ہوتا)، نقوش ص ۲۵۹ مین اس کا مطلب یہ لکھا ہے کہ

"شیخ کی برکت تھی کہ ایک مر گیا، اور دوسرا ناکام رہا"،

لیکن عرب و ہند کے تعلقات ص ۳۰۰ (الٰہ آباد) مین اس کا مطلب مین نے یہ لکھا تھا کہ

"شیخ کی برکت ہے ایک مر گیا اور ایک ناکام بھاگا"،

مجھے ہمیشہ سے اس لفظ کی صحت کی تلاش تھی، کراچی آنے کے بعد سندھ اور ملتان کے دوستون سے اس کے تیاسی صحیح تلفظ کا پتہ "نٹھا" چلا، جو ملتانی مین "بھاگا" کے معنی مین ہے، یہی لفظ فارسی مین نقل کیا گیا ہوگا جو کتاب مین تھا یا نہا کی شکل مین چھپا ہے،

یہ ایک جملہ معترضہ تھا جو ایک لفظی تصحیح سے متعلق تھا،

۲- دوسری اہمیت اس کتاب کی اس خطبہ صدارت مین ہے جو ۱۹۳۹ء مین کلکتہ مین پڑھا گیا، تھا، یہ خطبہ مشرقی پاکستان کے مسلمانون کے آج بھی پڑھنے کے لائق ہے، اس سے انھین معلوم ہوگا کہ اردو کی اہمیت ان کے لئے کیون ہونی چاہئے اور انھین کیون اس کو اپنی قومی زبان بنانی چاہئے، اب حالات بالکل بدل گئے ہین، اب دلائل واقعات کی صورت مین ان کے سامنے ہین، اور اب سارا معاملہ ان کے اختیار مین ہے، اور ان سے اخیر بار ناصحانہ یہ کہدینا ہے کہ بنگال کی اکثریت کو ہندو کلچر اور ہندو تھالوجی اور ہندو ادب کی غلامی سے اس وقت تک نجات نہین مل سکتی، جب تک وہ اپنی زبان کو سنسکرتی بنگالی اور سنسکرتی خط سے آزاد نہ کرین گے، اور خدا کا شکر ہے کہ اس سلسلہ مین مشرقی پاکستان مین کام شروع ہو گیا ہے،

۳- تیسری اہمیت اس کتاب کی یہ ہے کہ اس کے خطبون اور مضمونون سے آغاز سے آج تک اردو کی پوری تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے، اوس کا آغاز اور اس کے عہد بعہد کی ترقی، اور اس کے مطبوعات، اور

منشورات کی رفتار اشاعت معلوم ہوسکتی ہے، اور اسی پرواز پر آئندہ بھی کام کیا جاسکتا ہے،

۴۔ چوتھی چیز یہ ہے کہ اس کتاب مین اردو کی ضرورت بقا، اور اہمیت کے تمام دلائل، واقعات اور اسباب پوری تشریح سے جمع ہوگئے ہین، اسی طرح مخالفین کے شکوک و شبہات اور اعتراضات کو تمام و کمال رفع کردیا گیا ہے،

۵۔ پانچوین چیز یہ ہے کہ ان مضامین مین اردو ہندی، ہندوستانی مباحث کے تمام پچھلے واقعات اور جس جس طرح غیر منقسم ہندوستان مین متحدہ زبان کے نظریہ کے متعلق تبدیلیان پیش آتی رہین، اون کی پوری روداد جمع کردی گئی ہے، جس سے یہ معلوم ہوگا کہ پچھلے پچاس برس کے عرصہ مین ملک کی زبان کا مسئلہ کس کس مرحلہ سے گذرا، اور سمجھوتہ کی کیا کیا کوششین کی گئین، اور ان کا انجام کیا ہوا،

۶۔ یہ مضامین گو سیاسی نہین ہین مگر حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کی زبان اور لٹریچر کے مسئلہ کو سیاست سے الگ بھی نہین کیا جاسکتا، اور اس سلسلہ مین اس کتاب کے مصنف کی حیثیت پوشیدہ نہین، اس کے مضامین اس کی اس حیثیت کی پوری غمازی کر رہے ہین، اوس نے ان لوگون کو جو سمجھوتہ کی ہر کوشش کو ٹھکرا کر سنسکرتی ہندی کو راشٹر بھاشا یعنی ملک کی زبان بنانے پر مُصر تھے ان خطرون سے برابر ہشیار کیا ہے، جو دو قومی نظریے کا سبب بنے، اور جو بالآخر ملک کی تقسیم کا باعث ہوئے، ۱۹۳۳ء مین مسلم یونیورسٹی کے اندر یونین ہال مین "ہندوستان مین ہندوستانی" پر جو مقالہ پڑھا گیا ہے، اور جو اس مجموعہ مین شامل ہے، اس کے ص ۳، پر یہ عبارت ملاحظہ فرمائین،

"ہندوستان مین زبان کا انقلاب ہوکر رہے گا، اور جس قدر ہندوستان زیادہ متحد ہوتا جائیگا اتنا ہی اسکی متحدہ زبان کا امکان بڑھتا جائے گا، جو لوگ ہندوستان مین دو زبانین پیدا کرنا چاہتے ہین، اُن کو ہشیار رہنا چاہئے کہ وہ اس موجودہ ہمالیہ سے بڑھ کر ایک اور ہمالیہ بنا رہے ہین، جو پہلے ہمالیہ سے زیادہ اونچا ہوگا، پہلا ہمالیہ چاہے ٹوٹ کر چور چور ہوجائے مگر ہندوستان

کو دو متفرق زبانون مین تقسیم کرنے سے دونون قومون کے درمیان ایک ایسا ہمالیہ کھڑا ہوجائیگا جو پھر قیامت تک ٹوٹ نہ سکے گا"

اس کے بعد کلکتہ اردو کانفرنس کے اجلاس منعقدہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۳۹ء کے خطبۂ صدارت مین جو معارف جلد ۴۵ نمبر ۲ مین شائع ہوا، اور وہ اس کتاب مین حصۂ خطبات کے اخیر مین شامل ہے، ناظرین کو یہ الفاظ ملین گے:-

"صاحبو! راہین دو ہین، ایک یہ کہ ہم سمجھین کہ ہندوستان خالص ہندوؤن کا ملک ہے، اس مین جو کچھ ہو وہ خالص ہندوانی ہو، زبان وہی ہو، لباس وہی ہو، تعمیر وہی ہو، مذاق وہی ہو، علم و فن وہی ہون، اور جو بھی اس ملک کی چاردیواری کے اندر ہو، وہ اسی کو کا محکوم ہوکر رہے، یہ راہ بیحد خطرناک، اور مشکلون سے بھری ہوئی ہے، اور اس راہ کی کامیابی مین بہت کچھ شک کیا جاسکتا ہے" (ص ۱۰۰)

"میرے نزدیک کسی ہندو طبقہ کا قومیت و وطنیت کے مفہوم کو اتنا تنگ سمجھنا کہ خود اس ملک کے مختلف بسنے والے بھی وہان کے اصلی رہنے والے ثابت نہو سکین، اُن کی وہی موروثی اور پرانی تنگ خیالی ہے، جس نے تاریخ مین اُن کو ہمالیہ اور سمندر کی چاردیواری مین بند اور ان مین چھوت اور اچھوت کی پرانی لڑائی، ہزارون برس سے کھڑی کر رکھی ہے، اور جس نے تاریخ کے ہر دور مین اُن کے اندر نفاق پیدا کیا ہے، اور ان ہی کے اندر کے مظلوم فرقون کو مجبور کیا ہے کہ وہ باہر کا سہارا ڈھونڈین، اور باہر والون کو اپنی مدد کے لئے اپنے گھر بلائین، اور نتیجہ مین اپنے ساتھ دوسرون کو بھی غلامی کی زنجیرون مین اسیر کرائین، یہ ایک تاریخی نکتہ ہے جسکی تفصیل کا یہ موقع نہین مگر جس کو کسی موقع پر بھولنا نہین چاہئے"

(صفحہ ۱۰۰)

"اس سے آگے بڑھ کر یہ کہنا اور سمجھنا کہ سنسکرتی ہی ہندی ہماری اصلی بولی ہونی چاہیئے، دیس کے اتحاد اور ایکتا کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا ہے" (ص ۱۸۰)

"میرے خیال مین یہ کانگریس کے ساتھ ہمدردی نہین، بلکہ کھُلی دشمنی ہے، اور مسلمانون کے ذہن مین یہ غلطی بٹھانی ہے کہ جب ہم آدھا اختیار پا کر یہ کر رہے ہین، تو پورا اختیار پا کر کیا کچھ نہ کرین گے، ملک کی پالیٹکس پر اس غلطی کا جو اثر اب پڑ رہا ہے، اور جو آگے پڑے گا، وہ چھُپا نہین، مین نے اس وقت صفائی سے جو کچھ کہا ہے امید ہے کہ ہمارے دوست اس کو نیک نیتی سے سنین گے، اور کہنے والے کی بھی نیک نیتی سمجھین گے"۔ (ص ۲۸۲)

اس سے بھی زیادہ صاف اور روشن لفظون مین پھر ہشیار کیا گیا :-

"ملک کی زبان کے مسئلہ کو طے کرنے کے لئے صحیح راستہ یہ ہے کہ ہندوستانی اردو یا اُس کو آسان ہندی کہہ لیجئے، ہندو مسلمانون کی مشترک زبان ہے، اور خالص ہندی کی حیثیت وہ ہے جو مسلمانون کی فارسی کی ہے، اور سنسکرت کا درجہ عربی کا ہے، اگر ہم سب اس تصفیہ پر ایک ہو جائین تو ہماری سب مشکلین دور ہو جائین، مگر افسوس ہے کہ ملک مین ایک طبقہ ایسا ہے جو صرف ہندی بلکہ سنسکرتی ہندی کو ہندوستان کی زبان بنانے پر تلا ہوا ہے، اور وہ ایک ایسی غلطی کر رہا ہے، جس سے قومی تنگ دلی کے سوا کوئی دوسرا فائدہ نہین پہنچ سکتا اور جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ **ملک دو حصّون مین بٹ جائے**"۔ (ص ۱۸۴)

سب سے آخر مین آخری تنبیہ ان لفظون مین پیش کی گئی :-

"مین پھر ہندو مسلمانون دونون سے اپیل کرتا ہون کہ وہ تنگ دلی اور چھوٹی قومیت کی غلط پاسداری کر کے اپنے ملک کو تباہ نہ کرین، اور کشتی مین وہ سوراخ نہ کرین، جس سے وہ پھر کبھی نہ بن سکے گی، اور جس کا نتیجہ سب کے لئے ایک ہو"۔ (ص ۱۸۹)

مگر یہ سب تدبیرین بیکار رہین، اور وہی ہوا جس کا ہونا مقدر تھا، اور اردو ہندی کا جھگڑا جو ۱۸۶۷ء سے شروع ہوا تھا، ۱۹۴۷ء مین اس طرح طے ہوا کہ دونون دو منطقون مین بٹ گئین جن مین سے ایک بھارت ہے اور دوسرا پاکستان،

بھارت مین اردو کا مستقبل بھارت نے گو اردو سے سرکاری اور تعلیمی زبان کی حیثیت سے اپنا پیچھا چھڑا لیا، لیکن کیا عوام کے بول چال، اور ایک طبقہ کی ادبی (لٹریری) حیثیت سے بھی اسکی زندگی آیندہ باقی رہے گی یا نہین، اس کے پہلے ٹکڑے کا جواب یہ ہے کہ جب تک ہندی کی عمومیت عوام مین اتنی مقبولیت اور وسعت نہ حاصل کرلے کہ وہ عوام کی زبان بن جائے، عوام کو اردو کی ضرورت باقی رہے گی، اور یہ کام ایک دو دن کا نہین، بلکہ صدیون کا ہے، دوسرے ٹکڑے کا جواب یہ ہے کہ یہ اوس طبقہ کی ہمت اور محنت پر موقوف ہے، تاہم چونکہ لڑکون کی تعلیمی زبان سنسکرتی ہندی بنا دی گئی ہے اس لئے ڈر ہے کہ رفتہ رفتہ اس زبان مین فارسی اور عربی عنصر کم ہوتا جائے گا، اور ہندی اور سنسکرت کے الفاظ بڑھتے جائین گے اس لئے دو تین نسلون کے بعد عجب نہین کہ بھارتی اردو پاکستانی اردو سے الگ ہو جائے، تاہم جب تک بھارت مین مختلف زبانین موجود ہین، آسان اُردو یا ہندستانی کی شکل مین اردو کا وجود ضروری ہو، وہ کسی کے مٹائے مٹ نہین سکتی، کیونکہ زبان نہ مٹائی جاتی ہے، نہ بنائی جاتی ہے، وہ خود فطرت کے اصولون پر جیتی اور مرتی ہے،

پاکستان مین اردو کا مستقبل پاکستان نے گو اردو کو اپنی سرکاری زبان مان لیا ہی، لیکن چونکہ پاکستان کے حصّہ مین وہ صوبے آئے ہین، جن مین سے ہر صوبہ کی اپنی ایک صوبہ کی زبان بھی ہے، اس لئے پاکستان کو اپنی سرکاری زبان کو تعلیمی زبان بنانے کے لئے بڑی محنت کی ضرورت ہے تاہم یہی حقیقت کہ پاکستان کے ہر صوبہ کی الگ الگ صوبہ وار زبان ہے، پورے پاکستان کے لئے ایک واحد متحدہ زبان کی ضرورت بالکل طبعی اور مسلّم ہے، اور اسی بنا پر پاکستان مین اردو کا مستقبل شاندار ہے، اور اس کا پرچم پنجاب کے مضبوط

ہاتھوں مین آتا نظر آتا ہے،

یہ بھی قدرتِ الٰہی کی عجیب مخفی حکمت تھی کہ چونکہ پنجاب کو آئندہ پاکستان کا دل بننا تھا، اس لئے ایسے موقعے پیدا ہوئے جن مین لاہور جدید اردو کی نشو و نما کا مرکز بن گیا، اور بجائے اس کے کہ پنجاب پنجابی کو اپنی ادبی اور لٹریری اور تعلیمی زبان بنائے، اُس نے اردو ہی کو اپنی ادبی اور لٹریری اور تعلیمی زبان بنایا، اور سب سے زیادہ اردو کی اشاعت کا کام یہین ہوا، اور یہ سب تمہید روز ازل مین اس لئے کی گئی تھی کہ پاکستان بننے کے بعد پاکستان مین اردو کی حیثیت مہاجر کی نہ ہو، بلکہ اہلِ وطن کی ہو،

مہاجرین کی جو بڑی تعداد بہار، یوپی، بمبئی، حیدرآباد، اور راجپوتانہ وغیرہ ریاستون سے آئی ہے، وہ اردو کو اپنے سینون کے ساتھ لگا کر لائی ہے، اور یہ سارے پاکستان مین بنگال سے لے کر پشاور تک پھیل گئی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ ہر صوبہ مین اردو بولنے والون کی بہت بڑی تعداد آباد ہے، اور اُن کے ذریعہ سے اردو پاکستان کے گوشہ گوشہ مین پہنچ گئی ہے،

اردو کے لئے سب سے مشکل مرحلہ سندھ اور بنگال مین تھا، مگر ان مہاجرین کے بدولت اردو ان دونون صوبون کی گلی گلی مین پھیل گئی ہے، اور ہر جگہ وہ بولی اور سمجھی جانے لگی ہے، بلکہ بیوپار اور تجارت کی زبان ہونے سے وہ بازارون پر قبضہ پا رہی ہے، اور کراچی پر تو پورا قبضہ اردو ہی کا ہے، اندرون سندھ مین صوبہ کی زبان کے ساتھ ہماری قومی زبان دوش بدوش ترقی کر رہی ہے، چنانچہ پشاور، راولپنڈی، لاہور، ملتان، حیدرآباد سندھ، کراچی، ڈھاکہ اور سلہٹ سے اردو زبان کے اخبارات اور رسائل کثرت سے نکل رہے ہین، اور پڑھے جا رہے ہین، پنجاب کے سرکاری دفترون مین وہ داخل ہو رہی ہے، اور یونیورسٹی کی تعلیم مین اُس کے ذریعہ تعلیم بننے کا فیصلہ کیا جا رہا ہے، کراچی مین ایک پورا کالج سارے مضامین کی تعلیم اردو مین دے رہا ہے، اسی طرح سندھی اور بنگالی اسکولون مین سندھی اور بنگالی کے ساتھ ساتھ اردو بھی پڑھائی جا رہی ہے، پھر تعلیم گاہون مین سندھی اور بنگالی طالب علمون کے ساتھ ساتھ اردو بھی پڑھائی جا رہی ہے؟

پھر تعلیم گاہون مین سندھی اور بنگالی طالب علمون کے ساتھ ہندوستان سے آئے ہوئے طالب العلم بھی پہلو بہ پہلو کلاسون مین تعلیم پا رہے ہین، اس کے دو اثر نمایان طور پر ظاہر ہو رہے ہین، ایک یہ ہے کہ ان صوبون کے طلبہ اردو بولنے چالنے کا موقع پا رہے ہین، اور عملاً اُن کی مشق بڑھ رہی ہے، دوسرا یہ کہ سندھی اور بنگالی سنسکرتی ہندی کے بجائے اردو سے ہم آہنگ ہو رہی ہے،

مملکتِ پاکستان کی عام زبان ہونے کے باعث اردو ایک اور میدان مین بڑھ رہی ہے، اور وہ بیرونی ممالک ہین، وہان کے سفرا یہان آ رہے ہین، یہان کے سفرا وہان جا رہے ہین، نتیجہ مین اردو دوسرے ملکون کے حدود مین قدم جما رہی ہے، مصر و شام کے سفیر اور سیلون کے ہائی کمشنر اردو سیکھ رہے ہین، عبدالوہاب عزام بے سفیر مصر اور عمر بہاء الامیری سفیر شام، اردو بولنے اور تقریرین کرنے لگے ہین، سیلون کے ہائی کمشنر برہان الدین جیا سمجھ لیتے ہین، اور کچھ بول بھی سکتے ہین، عزام بے اقبال کے اردو کلام کا عربی مین ترجمہ کر رہے ہین، اسی طرح ہمسایہ ممالک ایران، عراق، بحرین اور کویت مین یہ اپنا قدم جما رہی ہے، پاکستان کی زبان ہونے کی بنا پر بعض یورپین بھی اسکے سیکھنے مین شوق دکھا رہے ہین، یہ سب آثار نیک اور اردو کے مستقبل کی تابناکی کا پتہ دیتے ہین،

مآل و مشیّت

از

جناب خان بہادر ظفر حسین صاحب ریٹائرڈ انسپکٹر مدارس

۱۹۴۷ء کے جون مین اس مقالہ کی پہلی قسط اور ستمبر مین دوسری قسط معارف مین شائع ہوئی تھی، آخر قسط ماہیت زمان کے سوال پر ختم ہوئی تھی، یہ تیسری قسط اسی سوال کا کچھ اوپر چار سال کے بعد جواب ہے، سماجی و مصنوعی زمان کے لغت مین اس سے بڑھ کر صحافت کی اور کیا رسوائی ہوسکتی ہے، لیکن حقیقی زمان کے پیمانہ مین جو موجودہ قسط کا موضوعِ بحث ہے، شاید آپ کو مرورِ زمانہ ناپنے کے لئے خط ہی نہ ملین، اور اس لئے میری معذرت کے بجائے شاید خود آپ کو اپنے فیصلہ پر نظرِ ثانی کی ضرورت پیش آئے، اصل یہ ہے کہ باطنی اوزان اور ہین اور ظاہری اور، غالب نے کسی ایسے ہی موقعہ پر اپنی صفائی یون پیش کی تھی،

با من کہ عاشقم سخن ننگ و نام چیست — در امرِ خاص حجتِ دستورِ عام چیست

صرفیون نے ظرفِ مکان کے ساتھ ظرفِ زمان کی اصطلاح چلا کر وقت کو بھی مکانی بنا دیا، یا یون کہیے کہ یہ اُن کا مکانی تصور فہمِ عامہ کا پرتو تھا، جو زمین کی طرح زمان کو بھی ظرف سمجھتی ہے، اور جس طرح سطحِ زمین پر عمارات، باغات اور مختلف اشیاء دوش بدوش دیکھی اور تصور کی جاسکتی ہین، زمانہ کے ظرف مین بھی تصور کیا جاسکتا ہے کہ یکے بعد دیگرے پیش آنے والے واقعات گویا یکے بعد دیگرے چنے ہوئے رکھے ہین،

سماجی ضرورتون نے اس خیال کو اور تقویت دی، کلاک گھڑی ایجاد ہوئی، اور برابر برابر کے بارہ حصون مین منقسم ڈائل نے گویا دنیا کے سامنے زمان کا چہرہ پیش کر دیا، لیکن کیا جنتریان، ٹائم پیس، گھڑیان وقت کا نام ہین، یا حقیقی وقت کی پیمایش کرسکتی ہین، کیا صدیان، سال، مہینہ، ہفتہ، دن، پہر، گھنٹے، منٹ اور سکنڈ صحیح معنی مین وقت ہین؟

آپ کو زمان کے مکانی مرقعے دیکھنا ہون تو زمانۂ حال کے کسی اسکول مین تاریخ کے کمرہ کا معائنہ فرمایئے، اس کمرہ کی چارون دیوارین آپ کو ٹائم چارٹون اور لائن آف ٹائم (خطِ زمان) سے لپی ہوئی نظر آئین گی، ان چارٹون مین صدیون کو انچون مین تحویل کرکے خطوط کی مدد سے وقت کا امتداد و تناسب ظاہر کیا جاتا ہے، اور پھر اس مکانی رعایت سے تاریخی واقعات ان پر پھیلا دیئے جاتے ہین، علیٰ ہذا اقتصادی اور معاشرتی ترقی کے نقشون مین سال بہ سال کی ترقی ایک مستقل مکانی پیمانہ مین دکھائی جاتی ہے، اور ان تمام ذرائع اظہار کا تصورِ زمان مکان کے تصور سے سو فیصدی آلودہ ہوتا ہے،

فلسفہ کی اکثر و بیشتر جستجو رہی ہے کہ زمان کا ایک ایسا منزہ تصور حاصل کرے، جو مکان اور اسکے متعلق تصورات کی آلودگیون سے پاک ہو، اور جس کو وقت کا تصورِ محض کہہ سکین،

وقت کی ماہیت کو سمجھنے کے لئے ایک نظر اُس کے ارتقائی مفہوم پر ڈال لینا ضروری ہے،

سب سے پہلے زمان کی وہ صنف ہے، جسے ہم زمانِ محسوس کہہ سکتے ہین، روزمرہ کی زندگی مین ہمارے شعور کے اندر احساسات کی آمد و رفت کا تانتا بندھا رہتا ہے، مختلف کیفیات یکے بعد دیگرے ہمارے نفس پر طاری ہوتی رہتی ہین، ان سب کا تماشا زمان کا پہلا دھندلا سا شعور ہے، ہم سڑک پر ایک موٹر جاتے ہوئے دیکھتے ہین، اُس کے بعد ہماری توجہ ایک دوکان کی آرایش کی جانب مائل ہو جاتی ہے، پھر دوسری دکان سے ریڈیو کی آواز ہمارے شعور پر قبضہ کر لیتی ہے، اس کے بعد ہمارے ذہن مین اس کام کا خیال خطور کرتا ہے، جس کو انجام دینے ہم گھر سے نکلے تھے، سب مل جل کر حال؛

ماضی، اور مستقبل کا احساس ہمارے ذہن مین پیدا ہوتا ہے، حال کے احساس کے ذمہ دار تو بہت کچھ ہمارے حواس خمسہ ہین، لیکن ماضی کا احساس حافظہ کی وساطت سے اور مستقبل کا احساس تخیل کے عمل سے ہوتا ہے، تنفس اور حرکت قلب سے بھی مرورِ زمان کا فی الجملہ احساس ہوتا ہے، یہ گویا انسان کے لئے جسمانی گھڑی کے پرزے ہین، جن کے شمار سے وقت کا حساب لگ سکتا ہے،

زمان محسوس ہر شخص کا پرائیوٹ تجربہ ہے، اُس کے مقابل مین سماجی وقت ہے، جو سوسائٹی کے ہر فرد کے مسلمات سے ہوتا ہے، اور جس کے بغیر ریل گاڑیان، ہوائی جہاز، سمندر کے جہاز، کارخانے اور دیگر معاشرتی کاروبار چل نہین سکتے، چنانچہ تمام سوشل زندگی کی مشین کسی نہ کسی سماجی وقت کی دُراز داو پر چلتی ہے،

تمدن کے ابتدائی دور مین اگرچہ وقت کی تقسیم اس قدر سائنٹفک نہ سہی، جیسی کہ اب ہے، لیکن روزمرہ کی زندگی کی ضرورتون کے لئے کچھ نہ کچھ تقسیم اوقات، ہر ملک اور ہر قوم مین رہی ضرور ہے، دیہاتی اب بھی دن رات کو آٹھ پہرون مین تقسیم کرتے ہین، چار پہر رات، چار پہر دن، اور آفتاب کے طلوع و غروب، دوپہر، سہ پہر، کوون کے بولنے، اور مویشیون کے واپس آنے سے وقت کا اندازہ کرتے، اور ان علامتون کے حوالہ سے آپس مین وقت کا تقرر کرتے ہین، چنانچہ یورپ کے ترقی یافتہ طبقون مین اب بھی کرکی کے جاڑے نومبر کے آنے کا پتہ دیتے ہین، اور روبن چڑیا جاڑے کے موسم کی نقیب ہے، ہندوستان مین کوئل موسم برسات کا اعلان کرتی ہے، ایران مین بلبل موسم بہار کا، ہندوستان مین اس وقت متعدد سماجی سال رائج ہین، فصلی، سمت، عربی، انگریزی وغیرہ اور طلوعِ آفتاب سے دوسرے دن طلوع آفتاب تک وقت کی چوبیس گھنٹون مین تقسیم سب سے زیادہ سہل ہے، اور اس لئے عام طور پر دنیا کے متمدن ممالک مین رائج ہے، یون دیہاتی اب بھی سال کو موسمون یا فصلون مین تقسیم کرکے اپنے معاملات کی قرارداد کرتے ہین، غیر متمدن آبادیون مین دنون کے

گذرنے کو لکڑی پر نشان کر دینے سے شمار کیا جاتا ہے، چنانچہ جزیرہ سلیمان مین اب بھی جب کوئی تقریب ہوتی ہے، تو جن کو بلایا جاتا ہے، اُن کے پاس ایک ایک ڈوری بھیج دیجاتی ہے، جس مین متعدد گرہین لگی ہوتی ہین، ہر روز ایک گرہ کاٹ دیجاتی ہے، جس روز ایک گرہ رہ جائے اسی روز تقریب ہے، ہندوستان کے بعض خاندانون مین مین نے دیکھا ہے کہ سال گرہ کی رسم بھی اسی اصول پر انجام پاتی ہے، جب بچہ اپنی زندگی کا ایک سال پورا کرتا ہے، تو کلاوہ کی ڈوری اس کے سر پر رکھکر کوئی بزرگِ خاندان گرہ باندھ دیتا ہے، اس گرہ مین اگر چاندی یا سونے کا چھلہ، پان اور ہری دوب گھاس کی پتیان بھی باندھی جاتی ہین، شروع مین شاید یہ گرہ اندازی اس لئے ہوئی ہوگی کہ گرہین گن کر عمر کا شمار کیا جا سکے،

علیٰ ہذا شمار و حساب کی سہولت کے لئے بعض وحشی قبائل مین اب بھی چاند کی شکلون کے اعتبار سے ہر مہینہ مین چند مخصوص دن حوالہ کے لئے مقرر کرلئے جاتے ہین، سال بھی اکثر مختصر ہوتا ہے، چنانچہ بورینو کی مین چھ ماہ کا سال ہوتا ہے، حالانکہ جزیرہ مین دو موسم ہوتے ہین، ایک تر اور ایک خشک،

جنتری اور گھڑی نشاۃ جدیدہ کے جیسا اوپر مذکور ہوا، رائج الوقت پیمانے ہین، سائنسدان سکنڈ کا ہزاروان حصہ بآسانی ناپ سکتے ہین، اور یہ تو ہم سب کا تجربہ ہے کہ اگر ہماری گھڑی دو منٹ سست یا تیز چلنے لگے، تو طبیعت مین الجھن پیدا ہونے لگتی ہے، اور اس وقت تک اطمینان نہین ہوتا جب تک گھڑی ساز سے گھڑی کی رفتار درست نہ کرالین،

حیوانات کو بھی وقت کا احساس ہوتا ہے، چنانچہ رومنیس (Romanes) نے اپنے رسالہ ذہانت حیوانات مین ایک ہنس کا ذکر کیا ہے، جو ہفتہ مین ایک مقررہ دن پر یعنی جمعرات کو جس روز بازار لگتا تھا، گرے ہوئے دانے چگنے کے لئے آتا تھا، ایک ہفتہ بازار نہین لگا، لیکن ہنس اپنے دستور کے مطابق آیا، راقم الحروف سے ایک صاحب نے اپنے کتے کا قصہ بیان کیا، جس کو کھوئے ہوئے طویل مدت گذر گئی تھی، ایک روز وہ اپنے نئے مالک کے ساتھ بازار جا رہا تھا، کتے کے قدیم مالک کو کچھ شبہہ ہوا، انھون نے

کتے کا اصلی نام لیکر آواز دی (دوسرے مالک نے کتے کا کچھ دوسرا نام رکھ چھوڑا تھا) کُتے نے فوراً پلٹ کر دیکھا، اور بے تحاشا اپنے پرانے آقا سے لپٹ گیا، بارش ہو چکی تھی، سڑکون پر کیچڑ تھی، ہرچند اصلی آقا اُسے ڈانٹ ڈپٹ رہے تھے، مگر کُتا جوشِ مسرت سے اُن کے اوپر چڑھا جا رہا تھا، اور اُن کے کپڑے کیچڑ مین لت پت کئے دے رہا تھا اس قبیل کی بہت سی مثالین ہین، جس سے پتہ چلتا ہے کہ حیوانات کو کچھ نہ کچھ وقت کی اٹکل ضرور ہوتی ہے، مذکورۂ بالا مثالون مین بھنس کو مستقبل کی اٹکل تھی اور کُتے کو ماضی کا اندازہ تھا، جس مین وہ اپنے پرانے آقا کی جگہ تلاش کرکے ماضی کے واقعات کا حافظہ کی مدد سے استحضار کرسکا،

زمان کی دوسری صنف زمانِ متصور ہے، یعنی وقت کا تصور محض جس مین احساس کا شائبہ نہین ہوتا، جس طرح دیگر محسوسات سے تجربہ کرکے ایک تصور بنایا جاتا ہے، مثلاً دیوان حافظ، دیوان میر، دیوانِ آتش سے دیوانِ محض کا تصور جو کوئی مخصوص دیوان نہین، لیکن سب کا کلی تصور ہے، اور سب مخصوص محسوس دیوانون پر دلالت کرتا ہے، اسی طرح محسوس زمان کی مثالون سے ایک مجرد تصور زمان ذہن اخذ کرلیتا ہے، جو مکان کی طرح تین ابعادِ ثلاثہ رکھتا ہے، یعنی حال، ماضی، مستقبل،

زمان کی تیسری صنف مابعد الطبیعاتی زمان ہے، جو محسوس زمان سے زیادہ حقیقی، اور قائم بالذات ہے، زمان کا یہ جوہر یا عین، اپنا ایک حقیقی وجود رکھتا ہے، جو ایک طویل بحث چاہتا ہے،

لیکن کسی مابعد الطبیعاتی بحث سے قبل ایک نظر اسی راہ کے سائنسی اکتشافات پر ڈال لینا نہایت مفید بلکہ ضروری معلوم ہوتا ہے، اس لئے زمان کی مابعد الطبیعاتی حقیقت کو پیش کرنے سے قبل ضروری ہے کہ سائنس کی تحقیقات کا ایک سرسری جائزہ لے لیا جائے،

شروع شروع مین ترکیبِ فطرت کا نظریہ یہ تھا کہ موجودات ذرات سے مرکب ہین، اور یہ ذرات اُن موجودات کے اجزائے لا تجزیٰ ہین، ہر ذرہ ناقابلِ نفوذ ہے، اور اس لئے کوئی ذرہ اس مکان مین نہین بس سکتا، جہان دوسرے ذرہ کی بود و باش ہو، ہر ذرہ ہر سمت حرکت کرسکتا ہے، چنانچہ ان کے

خطوطِ حرکات ایک دوسرے کو منقطع اور ذرات اپنے ہر سفر کے بعد ایک ہی وقت مین اپنے اپنے مقام پر آجاتے ہین، لیکن جب وہ ایک دوسرے سے ٹکراتے ہین، تو اس ٹکر سے اُن کے حرکات کی سمت بدل جاتی ہو، اس نظریہ کے مطابق ہر ذرہ مین قوتِ حرکی مخفی تسلیم کی گئی ہے، جس کی بنا پر وہ ایک خطِ مستقیم مین ایک مقررہ رفتار پر حرکت کرتا یا کسی مقررہ مقام پر قائم رہتا ہے، سترہوین صدی عیسوی کی طبیعیات کا ماحصل یہی تھا، جو دراصل قدیم یونانی نظریہ ذریت ہی کی ایک جدید شکل تھی، یہی نظریہ دو صدیان اور ماہرین سائنس کی فکر پر حاوی رہا، چنانچہ حرکتِ ذرات کا تصور نیوٹن کے وقت تک سائنس کا محور خیال رہا،

نیوٹن کی فکر رسا نے ہر ذرہ کو کشش ثقل بخشی، چنانچہ حرکت کی تشریح کے لئے ایک جھوڑ دو باتین رائج ہوگئین، ایک تو وہی پرانا خیال، یعنی یہ کہ ہر ذرہ مین حرکت کی قوت ودیعت ہے، اور اُن کا تصادم ہوتا ہے، دوسرے نیوٹن کی کشش ثقل،

نیوٹن کے نزدیک مکان ایک خلاء محض تھا، جس کو آگے چل کر سائنس نے ایتھر سے بھرا، ایتھر ایک ایسا مادہ تھا، جو ناقابلِ تقسیم تھا، نا مزاحم تھا، لطیف تھا، بسیط تھا، لچکدار تھا، اور اپنے مقام پر مستحکم بھی، غرضکہ وہ ان صفات سے اس وجہ سے متصف تھا، کہ ذرات کی لہرون کو بے کم و کاست اپنی فضا مین آگے بڑھاتا چلا جائے، یا پھر یون کہئے کہ ایتھر کو فرض ہی اس لئے کیا گیا تھا کہ یہ ناگزیر فریضہ انجام دے، ظاہر ہے کہ ایک ایسا مجموعہ اضداد زیادہ عرصہ نہین چل سکتا تھا، اور زمانۂ حال کے محققین سائنس کو اُسے خیرباد کہنا پڑا،

جان ڈالٹن کے کیمیائی اکتشافات نے پرانے نظریۂ ذریت مین ایک پیچیدگی پیدا اور پلید کی، وہ یہ کہ ہر عنصر کے ذرات جداجدا طبیعی خصوصیات رکھتے ہین، لیکن یہ فرق کیفی نہین بلکہ کمی ہے، چنانچہ ڈالٹن کے نظریہ کے مطابق ذرات اپنی مقدار اور وزن کے لحاظ سے مختلف تھے، لیکن طبیعیات کی نظر مین ہر ذرہ مادہ کی اکائی اور آخری جزو کی حیثیت سے یکسان اور مساوی الوزن تھا، چنانچہ پچاس برس کا پرانا تصادم جو کثیف مادہ اور لطیف ایتھر مین پیدا ہوا تھا، وہ طبیعیات کے مادہ اور کیمیا کے مادہ مین از سر نو رونما ہوگیا،

حتی کہ برقیہ (الکٹران) کے اکتشاف نے طبیعیات اور کیمیا مین صلح کرائی، مشہور عالم ماہر طبیعیات بوآر کے اکتشاف کے مطابق ہر ذرہ چند منفی و مثبت برقیون پرمشتمل ہے، ہر ذرہ کا نواۃ یا مرکز مثبت برقیون (پروٹون) سے بنا ہوتا ہے، جس کے چارون طرف منفی برقیون کا حلقہ ہوتا ہے، ہر کیمیائی عنصر مین مثبت و منفی برقیون کی تعداد مختلف ہوتی ہے، منفی برقیے اپنے نواۃ کے چارون طرف گردش کرتے رہتے ہین بعض عناصر مین اُن کی گردش کی رفتار روشنی کی رفتار کے برابر ہوتی ہے، جدید طبعی تحقیقات کے مطابق ہر ذرہ نظام شمسی کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے، جس کا نواۃ یا مرکز آفتاب اور منفی برقیات دیگر اجرام فلکی کے قائم مقام ہین، ہر ذرہ کی کیفیت ایک برقیہ کے حذف و اضافہ سے تبدیل ہوجاتی ہے، الغرض اب ہمارا جزر لایتجزی ذرہ نہین بلکہ برقیہ یا الکٹران ہے،

چنانچہ ہر ذرہ کی خصوصیت برقیہ کی نوعیت پر مبنی ہے، نہ کہ اُس کے وزن پر اور یہ نوعیت قطعاً کی ہے، ہر برقیہ کا ایک مخصوص انداز رقص ہے، علی ہذا اب ہائڈروجن کی نوعیت برقیون کی تعداد و ترتیب نہین، بلکہ اُن کے مخصوص انداز رقص سے متعین تصور کی جاتی ہے،

ہر برقیہ اپنی آخری تحلیل مین حرکت کے سوا کچھ نہین، چنانچہ کائنات کا ہر ذرہ ایک حرکت بنجانے کے بعد زمان ہی کا ایک عمل ہوگیا، اور مادہ کے خصوصیات اور اخلاق وحیات کے خصوصیات کا فرق مٹ جاتا ہے، جس طرح اخلاقیات مین ہر انسان اپنے عمل سے اور حیاتیات مین ہر عضویہ (آرگینزم) اپنے فعل سے جانا پہچانا جاتا ہے، اسی طرح اب طبیعیات مین مادہ کے ہر عنصر کی شناخت اُس کے عمل اور فعل ہی سے کی جاتی ہے، کلاسکل طبیعیات کی شدید غلطی یہ تھی کہ اوس نے حرکت کو مادہ سے جدا کر دیا تھا،

جدید نظریہ کے مطابق مادہ سرتا سر ایک عمل یا حرکت ہے، اور اس لحاظ سے زندہ اور مردہ مادہ مین کوئی فرق نہین، چنانچہ الکزنڈر کے نزدیک، زمان (جو حرکت کا ہیولی ہے) نفس اور مکان

اس کا جسم ہے اور وہائٹ ہڈ کی نظر مین کل کائنات ایک عظیم الشان عضویہ ہے،

ان امور پر آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافیت کا اور اضافہ کر لیجیے جس کے لحاظ سے حرکت ایک اضافی شے ہی اور زمان و مکان مل کر ابعاد ثلاثہ مین ایک چوتھے بُعد کا اضافہ کرتے ہین، چنانچہ عمرو کا حال زید کا مستقبل اور بکر کا ماضی ہوسکتا ہے، قدیم طبیعیات کی نظر مین زمان و مکان لاانتہا تھے، لیکن جدید طبیعیات کی نظر مین حرکات مختلف و متعین واقعات کی صورت مین اپنی تشکیل کرتے ہین، یا ایک حرکت دوسری حرکت کو بالکل کاٹ دیتی ہے، اور اُس کی کوئی قدر و قیمت، اور اس کا کوئی وجود نہین رہتا، چنانچہ زمان و مکان محدود و متعین ہین، اور نظریۂ اضافیت کے روسے اُن کی نا متناہیت کی اگر کوئی شکل ہے، تو وہ یہ ہے کہ مادہ کے سفر کی راہین تمام کائنات مین بجائے مستقیم ہونے کے منحنی ہین، چنانچہ ہر خط گھوم پھر کر اپنے ابتدائی نقطہ پر واپس آجاتا ہے، اس لحاظ سے اُسے لامتناہی کہہ لیجیے، اگرچہ حقیقت مین وہ محدود ہے، اس لئے کہ وہ ایک متعین مفہوم رکھتا ہے، لیوکریشس نے سوال کیا تھا کہ اگر عالم محدود ہے تو بتایئے کہ اُس کے کنارہ پر پہنچ کر اگر نیزہ پھینکا جائے، تو کہان جائے گا ؟ اس سوال کا جواب، کائنات کے خطوط منحنی سے جو ہر حرکت کی مقررہ راہین ہین، تشفی بخش مل جاتا ہی،

چونکہ تمام عالم یکسر حرکت و عمل تسلیم کر لیا گیا ہے، اس لئے اب سربرآوردہ محققین سائنس مثلاً ڈنگمین اور جینس کا خیال ہی کہ وہ کسی محرک و عامل کا محتاج بھی ہے، چنانچہ موجودہ سائنس مادیت کے مرکز سے ہٹ کر اب اوس راہ پر آرہی ہے، جس کے راہبر افلاطون، ارسطاطالیس، گیلیلیو، نیوٹن، کانٹ، اور ہیگل تھے،

میری یادداشت یہان تک قلمبند ہوچکی تھی کہ ۲۴ر جنوری ۱۹۵۱ء کے ہندوستان ٹائمس مین گلوب کے حوالہ سے ایک خبر نظر سے گذری کہ مسٹر جارج ڈی لاوار جو آکسفورڈ شائر کے ایک ممتاز انجینیر ہین، ایک ایسی مشین ایجاد کی ہے جو ماضی کے واقعات کی تصویر کھینچ سکتی ہے، چنانچہ ایک علمی انجمن مین تقریر کرتے ہوئے انھون نے

کہا کہ حکومت کے امتناعی قوانین کی پابندیون کی وجہ سے وہ اُس آلہ کا مظاہرہ تو پیش نہین کرسکتے لیکن اُسکے نتائج بیان کرسکتے ہین چنانچہ انھون نے اپنی شادی کی جس کو بیس سال ہوگئے تھے تصویر کھینچی ہے اور ایک مفقود الخبر شخص کا اس کی تصویر پر اُس آلہ سے عمل کرکے پتہ چلایا ہے، انھون نے بتایا کہ یہ آلہ اس نظریہ کے اصول کی بناپر بنایا گیا ہے کہ ہر خیال، ہر عمل اور ہر واقعہ سے فضا مین کچھ ایسی مخصوص لہرین پیدا ہوجاتی ہین، جن کو دوسری لہرون سے ممتاز وجدا کیا جاسکتا ہے، اور یہ لہرین فضا مین ہمیشہ قائم رہتی ہین، چنانچہ آلہ کو اس واقعہ، خیال یا عمل کے زمان ومکان پر لگا دینے کے بعد اُس کے اندر لہرین اسی طرح آنے لگتی ہین، جیسے ٹیلی وزن ریڈیو سٹ مین،

طبعیات کی ان جدید تحقیقات کے ساتھ ایک نظر حیاتیات کی جدید تحقیقات پر بھی ڈال لیجئے، یہ نظریہ تو عرصہ سے مسلّم تھا کہ کچھ مظاہر تو ایسے ہوتے ہین، جن کے اسباب کا ہم استقرا سے سُراغ لگاسکتے ہین لیکن کچھ مظاہر ایسے ہوتے ہین جن کے اسباب کا استقراء سے پتہ نہیں چلتا، مثلاً نمک، سوڈیم، اور کلورین کی ترکیب سے بنتا ہے، لیکن اُس کے ذائقہ اور اُسکی بلورین شکل کو ان دونون اجزاء سے دور کا بھی لگاؤ نہین معلوم ہوتا، یہ دونون خاصیتے یعنی ذائقہ اور شکل بالکل نئے پیدا ہوجاتے ہین، دورانِ ارتقاء مین یہ فجائی عمل ہمیشہ کارفرما رہتا ہے، چنانچہ مارگن نے اس موضوع پر اپنی کتاب کا نام ہی ارتقاے فجائی (امرجنٹ ایوولیوشن) رکھا ہے، ارتقاء مین بارہا ایسے مقامات آتے ہین، جب اجزاے ترکیبی ایک نئی ترتیب وتنظیم اختیار کرکے بالکل نئی شے پیدا کرتے ہین، جیسے مردہ مادہ سے حیات کا پیدا ہوجانا، کائنات گویا ایک ایسا بلند مینار ہے، جو متعدد منزلون مین منقسم ہے، بقول مارگن اس مینار کی پہلی منزل ذرات کا اجتماع ہے، جس کو ہم ذریت کہہ سکتے ہین، پانی نام ہے آکسیجن کے ایک ذرہ اور ہائڈروجن کے دو ذرّون کی کیمیائی ترکیب کا، اس منزل کے اوپر دوسری منزل وہ ہے جہاں ذرات باہم گُھل مل کر سالمات بناتے ہین، چنانچہ اس تنظیم کو ہم سالمیت کہہ سکتے ہین، اس کے اوپر تیسری

منزل ہے، یا تیسری تنظیم ہے، جو ذرات وسالمات کے نت نئے علائق سے ترتیب پاکر بلور کی شکل مین رونما ہوتی ہے، جسے ہم بلوریت کہہ سکتے ہین، اس کے اوپر جسم نامی کی منزل ہے، جس کا مابہ الامتیاز حیات ہے، ب کے اوپر ترتیب وتنظیم کی ایک بالکل انوکھی شکل نمودار ہوتی ہے، جس کو نفس کہتے ہین، ہر نئے طبقہ کا ظہور مارگن کے خیال کے مطابق کسی مخفی قوت کی کرشمہ سازی ہے، اب اس کا نام خواہ قوت رکھ لیجئے، یا نفس یا خدا (ارتقائے فجائی ص ۳۵، ۳۶)

تاریخ فلسفہ شاہد ہے کہ ہر عہد مین سائنس کے اکتشافات کا نقطۂ آخر، مابعد الطبیعیاتی فکر کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے، اس اصول کو مدِ نظر رکھتے ہوے، سوال یہ ہے کہ موجودہ سائنسی تحقیقات کا وہ کونسا اخیر نقطہ ہے، جس سے ہمین آیندہ مابعد الطبعیات کا خط کھینچنا ہے، جو سائنس کی تمام تحقیقات کے لئے جو مشاہدہ پر مبنی ہین، عقلی بنیاد کا کام دیسکتا ہے،

سائنس کے سارے اکتشافات کا حاصل ہم نے ابھی دیکھا کہ "حرکت" ہے، جو اپنی آخری تحلیل مین تواتر، تغیر اور عدم تقلیب ہے، چلتی ہوئی ٹرین اور ساکن ٹرین مین کیا فرق ہے؟ چلتی ہوئی ٹرین پٹری پر تواتر اپنا مقام بدلتی ہوئی آگے بڑھتی ہے، یعنی اس کی حرکت مین تواتر، تغیر اور عدم تقلیب ہے، اسی تواتر، تغیر اور عدم تقلیب کے مجموعہ کا نام زمان ہے، چنانچہ حرکت دوسرے لفظ مین زمان ہے، اور اس لئے اکثر فلاسفہ مثلاً سموئیل الکزنڈر (مصنف مکان، زمان اور الوہیت) حرکت کو زمان ہی کہتے ہین، اور جن کی نظر مین حقیقی زمان کا مرتبہ ماورائی ومابعد الطبیعیاتی ہے، وہ حرکت کو "زمانِ معروضی" کہتے ہین،

اس تقدیر سے ساری کائنات کا ہیولیٰ زمان ہی ہوا، اور اس لحاظ سے جب ہم کائنات یعنی معروضی زمان پر نظر کرتے ہین، تو معلوم ہوتا ہے کہ جملہ ارتقاے حیات اپنے سامنے کوئی نہ کوئی مقصد رکھتی ہے جس مین یہ حرکت تحویل ہوکر پھر آگے بڑھتی ہے، اور پھر آگے کے مقصد مین متشکل ہوکر اور آگے بڑھتی بڑھتی، اور مختلف منازل طے کرتی کرتی موجودہ منزلِ ارتقاء تک پہنچی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معروضی زمان

صرف ایک جہت رکھتا ہے یعنی مستقبل یا اُسی منظر کو دوسرے رُخ سے دیکھا جائے، تو یون کہہ سکتے ہین کہ یہ مقاصد جن کا مستقر مستقبل ہے کشش کی ایسی لہرین الیکٹران کی جانب پھینک رہی ہین کہ جس کے اثر سے کشان کشان یہ اُسی طرف کھنچے چلے جاتے ہین، چنانچہ اصل لہر مستقبل کی جانب جانے والے الیکٹران کی نہ ہوئی، بلکہ مستقبل کی جانب سے الیکٹران کی سمت آنے والی لہر ہوئی، اس لئے زمان کی رفتار حال سے مستقبل کی جانب نہین، بلکہ حقیقۃً مستقبل سے حال کی جانب آنے والی ہوئی، چنانچہ بعض حکما کا یہی عقیدہ ہے کہ زمان کی رفتار مستقبل سے حال کی جانب ہے، نہ کہ ماضی سے حال مین ہوتی ہوئی مستقبل کی جانب، مثلاً مقناطیس کی پُرکشش لہرین لوہے کے ٹکڑون کی حرکت پر مقدم ہین، اور لوہے کے ٹکڑون کا مقناطیس کی جانب کھنچ کر حرکت کرنا، اصل حرکت یعنی جذب مقناطیس کی معروضی وظاہری شکل ہے، اصل حرکت جذب ہے، انجذاب ثانوی مظہر ہے، جو ہمارے پیشِ نظر ہوتا ہے، لیکن ہم اسی کو حقیقی مظہر سمجھ لیتے ہین،

لیکن حرکت کائنات جسے سائنس نے ثابت کیا اور جسے مابعد الطبیعاتی زمان مین ہم نے ابھی معروضی زمان کہا اپنی گذران کی پیمایش کے لئے ایک اور زمان کا محتاج ہے، اسکو ہم موضوعی زمان کہین گے اور چونکہ موضوعی زمان معروضی متحرک زمان کا پیمانہ ہے اس لئے موضوعی زمان کو غیر متحرک اور قائم تسلیم کرنا ہوگا، اگرچہ جہان تک محسوس ہونے کا تعلق ہے، ہمین معلوم ایسا ہوتا ہے کہ گویا موضوعی زمان گذر رہا ہے، چنانچہ اکثر فلاسفہ نے تواتر ادراکات و تصورات کی بنا پر نفسی یا موضوعی زمان ہی کو رواں تصور کیا ہے، لیکن اس کی ایک بدیہی مثال یہ ہے کہ جب آپ ٹرین مین بیٹھے ہوتے ہین، جو اپنی پٹری پر رُکی ہوئی ہے، اور دوسری ٹرین کو دیکھتے ہین جو حرکت مین ہے، آپ کو ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ آپ کی ٹرین جارہی ہے، اور دوسری ٹرین جو فی الواقع حرکت مین ہے، رُکی ہوئی ہے، اصل واقعہ کی تصدیق آپ دوسری کھڑکی سے پلیٹ فارم کو دیکھ کر کرتے ہین، اور پھر مجبوراً یہ قائم کرتے ہین کہ درحقیقت آپ کی ٹرین قائم اور دوسری ٹرین متحرک ہے،

بہر طور اگر معروضی زمان متحرک ہے جیسا کہ مسلّم ہے، تو اُس کی پیمایش کے لئے دوسرا زمان کلاک کے ڈائل کی طرح ساکن ہونا ضروری ہے، جو متحرک سوئیون کو بتاتا رہتا ہے کہ اب وہ کس ہندسہ پر پہنچین، اور چونکہ غایات کائنات کو مختلف مقناطیسی مرکزون کی حیثیت سے ہم نے قائم تصور کیا ہے، اس لئے اُن کا مقام معروضی زمان کے اندر نہین ہوسکتا، جو مسلسل متحرک ہے، یا حرکت ہی حرکت ہے بلکہ اُن کی جگہ گھڑی کے ڈائل کے ہندسون کی طرح موضوعی زمان ہی مین ہوسکتی ہے، جن کو ہماری فکر جو اپنی ماہیت مین خود موضوعی زمان ہی ہے، احاطہ کرسکتی ہے، یعنی غایاتِ عالم جو معروضی زمان سے روپوش ہین، موضوعی زمان کے سامنے بے نقاب ہو جاتے ہین، بلکہ ایک لحاظ سے موضوعی زمان کے اجزاے ترکیبی ہین، اس لئے کہ موضوعی زمان کے تمام قائم لمحات انہی غایاتِ ثابتہ سے مرکب ہین،

انسان چونکہ جسم و نفس سے مرکّب ہے، اس لئے اس مین دونون زمان یعنی معروضی و موضوعی زمان کار فرما ہین، دماغ کے ارتعاشات، معروضی زمان کی حرکت ہین، جن کی پیمایش کا آلہ نفس یا موضوعی زمان ہے،

موضوعی زمان مین انسان کا پورا مستقبل مضمر ہے، اور اس کا کامل شعور ناممکنات سے نہین بشرطیکہ موضوعی زمان کو معروضی زمان کی میکانکی پیمایش سے فرصت ملے، اور ابعادِ ثلاثہ یعنی عرض طول حجم اور معروضی زمان کی الجھنون سے سانس لینے کا موقع ملے، جیسا کہ بعض اوقات عالمِ خواب مین ہوتا ہے، جی ڈبلو ڈن نے تجرباتِ زمان مین اسی نظریہ پر سیر حاصل بحث کی ہے، اور کثیر التعداد خوابون کی تحلیل کرکے یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ خواب مین دو جزو شامل ہوتے ہین، ایک ماضی کا عکس، اور دوسرے مستقبل کا پرتو، چنانچہ انھون نے بہت سے خوابون کی مثال دی ہے، جن مین مستقبل کے واقعات کی جھلک نظر آتی تھی، اور پھر وہ واقعات پیش آئے، اسی کے ساتھ ڈن کا نظریہ دیگر ماہرینِ نفسیات کے ساتھ یہ بھی ہے کہ ایسا کبھی نہین ہوسکتا کہ انسان مسلسل سوئے اور خواب نہ دیکھے، ہوتا یہ ہے کہ خواب کے نقوش بہت جلد محو ہوجاتے ہین، چنانچہ خواب یاد

کرنے کی تدبیر ڈن نے یہ بتائی ہو کہ انسان بیدار ہو کر یہ سوال نہ کرے کہ مین کیا خواب دیکھ رہا تھا، بلکہ یہ سوچ
کہ مین ابھی ابھی کیا خیال کر رہا تھا، جہان ایک کڑی یاد آئی، پھر سارا خواب از خود یاد آتا جائے گا، دوا یہ
تجربہ تکیہ کے نیچے ہمیشہ کاغذ اور پنسل رکھنا چاہئیے، اس لئے کہ سو جانے کے بعد یاد آیا ہوا خواب پھر فراموش
ہو جائے گا، اور پھر اُسے یاد کرنے کا کوئی امکان باقی نہ رہے گا، آنکھ کھلتے ہی خواب کو یاد کر کے کاغذ پر
ٹانک لینا چاہئیے، معروضی زمان کے شیشہ پر موضوعی زمان کا فوکس ہمیشہ حال کے نقطہ ہی پر رہتا ہے،
چنانچہ ماضی کی یاد بھی حال ہی مین واقع ہوتی ہے، اور مستقبل کی جھلکیان بھی حال ہی مین نظر آتی ہین،

معروضی زمان کا لمحہ جب تک متحرک نہ ہو اپنی ماہیت مین اقلیدس کے نقطۂ نظر سے مختلف نہین،
چنانچہ اگر آپ کسی چلتے پھرتے آدمی کا کسی تیز لینس والے کمرہ سے فوٹو کھینچین تو تصویر کچھ اس طرح آئیگی
کہ ایک پاؤن آگے بڑھا ہوا، اُس کے ساتھ ایک ہاتھ بھی آگے بڑھا ہوا، داہنے پاؤن کی ایڑی اٹھی
ہوئی اور بائین پاؤن کا پنجہ اٹھا ہوا، تیز لینس کے کیمرے بندوق سے نکلتی گولی تک کا فوٹو دیتے
ہین، جن کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ ہماری نظر گولی کو نہین دیکھ سکتی، لیکن وہ فوٹو مین ساکن ہی معلوم ہوتی
ہے، غرض کہ جب تک معروضی زمان کے لمحہ مین حرکت نہ ہو یعنی زمان مین امتداد نہ پیدا ہو، زمان کے
اندر تواتر و تغیر کے خصوصیات پیدا نہین ہوتے، اور زمان و مکان مین کوئی تفریق نہین کی جا سکتی،

الکزنڈر مکان کو زمان کا جسم تصور کرتا ہے، زمان روح ہے، اور مکان جسم، لمحہ اور نقطہ قیام و سکون
مین واحد ہین، لیکن نقطہ کو حرکت دیدیجئے، تو خط کی تخلیق ہو جاتی ہے، خط کو حرکت دیجئے تو سطح کی تخلیق ہوتی
ہے، اور سطح کو حرکت دیجئے تو کعب بن جاتا ہے، چنانچہ ابعاد ثلاثہ زمان ہی کے حرکات کی پیداوار ہین،
اس لئے مکان زمان کا مخلوق ہے،

مقولات (Categories) جس پر ارسطا طالیس، کانٹ، ہیگل اور دیگر فلاسفہ
نے مختلف نقطۂ نظر سے بحث کی ہے، مکان کی طرح معروضی زمان ہی کی مخلوقات مین، ابعاد ثلاثہ

کی تخلیق کے ساتھ، زمان، کمیت اور اُس کے تحتانی مقولات: وحدت، کثرت، اور کلیت کی بھی تخلیق کرتا ہے
علی ہذا مختلف غایات کے حصول پر معروضی زمان کے حرکات کے نقشون مین جو تغیرات پیدا ہوتے ہین
وہ کیفیت کے مقولات اثبات، نفی، تحدید کی تشکیل کرتے ہین، اسی طرح معروضی زمان کے تواتر و تغیر اور
اُس کی اُس فطری رفتار سے جو ہمیشہ غایات کی جانب رہتی ہے، علیت معلولیت، تعامل، عرضیت اور
جوہریت کے مقولات رونما ہوتے ہین، چوتھا مقولہ (کانٹ کے نظام فلسفہ کے مطابق) یعنی جہت (موڈ الٹی)
کے ماتحت جو مقولات متعین ہوتے ہین یعنی امکان و محالیت، وجود و عدم، وجوب و اتفاقیت، یہ تمام
مقولات بھی مختلف غایات کے حصول و عدم حصول سے مرتب و متعین ہو جاتے ہین، چنانچہ ان تمام مقولات
کی حیثیت معروضی ہے نہ کہ موضوعی، فلاسفۂ قدیم کا یہ عام دستور رہا ہے کہ جو شے ادراک سے باہر ہو اُسے
نفسی اور غیر معروضی قرار دیدیتے ہین، حالانکہ جو شے فکر سے حاصل ہو کر ادراک مین شامل ہو کر اس
کا اتمام کرے، وہ کچھ کم معروضی نہین، چنانچہ ہمارے ادراکات مین تصورات کا بیشتر حصہ شامل رہتا ہے،
مثلاً مخاطب کی پشت آپ کے سامنے نہین، لیکن تصور مخاطب کے ادراک مین اُس کا بھی اضافہ کرتا ہے، اور
اگرچہ وہ براہ راست محل ادراک نہین ہے، بلکہ موضوع تصور ہے، مخاطب کے ادراک سے خارج نہین کیجا سکتی،
اور نہ اس کو غیر معروضی کہا جا سکتا ہے، اس لحاظ سے تمام مقولات غیر تجربی نہین، بلکہ تجربی ہین، اور خارج
مین اُسی طرح اپنا وجود رکھتے ہین، جیسے رنگ و بو، سُرخ رنگ کا سبز رنگ سے امتیاز شعاعون کے مختلف وضع
و مختلف ارتعاش پر مبنی ہے، اور یہ حرکات اپنی آخری تحلیل مین جا ہے وہ عرضی صفت جسے عرف عام
مین ہم رنگ کہتے ہون، نہ رکھتی ہون لیکن رنگ کو ہم ارتعاش سے جدا نہین کہہ سکتے، اور سائنس
کی زبان مین اسی کا نام رنگ ہے، مابعد الطبیعیاتی نظریہ کے تحت رنگ و بو، ارتعاش، الغرض حرکت ہونے
کی حیثیت سے زمان ہی ہے، جو مظاہر عالم (Phenomenon.) کے میدان مین ایک
حرکت اور سلسلۂ علت و معلول کی شکل مین ظاہر ہوتا ہے، جو اُس کی معروضی حیثیت ہے، اور ذات شے

(Noumenon) کے پہلو میں اقدار، غایات، معانی تعینات اور مقدرات کی شکل میں قائم ہوتا ہے (یا تعبیر کیا جاتا ہے) اور یہ موضوعی زمان کا میدان ہے،

موضوعی زمان کا حال جو فی نفسہٖ قائم ہے، لیکن معروضی زمان کی حرکت کی وجہ سے متحرک نظر آتا ہے، ویسا ہی ہے، جیسے نفسیات میں توجہ کے مرکز کا جو محسوسات کے تغیرات کے ساتھ بدلتا معلوم ہوتا ہے، ورنہ اپنی ماہیت میں اس سے زیادہ نہیں کہ ارادہ نے شعور کو سمیٹ کر توجہ کی شکل میں ایک جگہ قائم کر دیا ہے، (اور ہمارے ارادہ کی آزادی کی یہ سب سے پہلی جھلک ہے) موضوعی زمان کا ہیولیٰ تمام تر ارادہ ہے، افکار تصورات، اقدار اور غایات اسی ارادہ کے مخلوقات ہیں، ان میں ردو بدل اور ترتیب و تنظیم تمام تر اسی کے ماتحت ہے، انسان اپنے جسم کی وجہ سے جس قدر معروضی زمان میں مجبور ہے، اسی قدر موضوعی زمان کے میدان میں قادر و آزاد ہے، اور توجہ کے مرکز کی پہنائی جس قدر زیادہ ہوتی جائے گی، اتنا ہی اس کے احاطۂ نظر میں مستقبل و ماضی کا زیادہ حصہ آتا جائے گا، نفس انسانی میں جہاں اور ملکات و قویٰ ہیں، وہاں ایک ملکہ یا قوت تاریخیت (Historicity) بھی ہے جس کو ماہرین نفسیات نے بالکل نظر انداز کیا ہے، اسی تاریخیت کی ترقی پر زمان کے ناقص و کامل تصور کا دار و مدار ہے، تاریخی قوت انسان میں دیگر قویٰ کے مقابلہ میں دیر میں پیدا ہوتی ہے، چنانچہ ذہنی پیمایش کے ماہرین نے تاریخ اور وقت کے امتحانات ۱۰ سال کی عمر سے شروع کئے ہیں، علیٰ ہذا قوموں کی نفسی ترقی کا اندازہ بھی اسی تاریخی احساس سے کیا جاتا ہے، جن قوموں میں تاریخی احساس پہلے بیدار ہوتا ہے، وہ ان قوموں سے افضل ہوتی ہیں جن میں تاریخی احساس یا تاریخیت بیدار نہ ہوئی ہو، یا بعد کو رونما ہوئی ہو،

گکھڑوں کی تاریخ کا گمشدہ ورق

از

الجناب راجہ محمد اسلم خان رئیس بکڑالہ ضلع جہلم

موقر جریدہ معارف جولائی، اگست ۱۹۲۷ء میں جناب مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی نے گکھڑ نامہ پر اپنا تنقیدی مقالہ شائع کیا ہے، اس میں بحوالہ فرشتہ تحریر کیا ہے، کہ گکھڑ قوم نے انند پال کی حمایت میں سلطان محمود غزنوی سے جنگ کی، میں نے ایک عریضہ ادارۂ معارف کو اسکی تحقیق کے لئے تحریر کیا، کہ کیا واقعی گکھڑوں نے سلطان سے جنگ کی تھی، کیونکہ گکھڑوں کا تو یہ دعویٰ ہے کہ وہ سلطان محمود کی معیت میں ہندوستان آئے، ادارۂ مذکور نے وہ عریضہ مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی کی خدمت میں احمد آباد روانہ کر دیا، چنانچہ جناب سید صاحب نے معارف مارچ ۵۹ء میں اس کا جواب شائع کیا، اور یہ بھی لکھا کہ میری کتاب گکھڑ نامہ جس کا وہ ترجمہ کر رہے تھے، مکمل ہو چکی ہے، جو عنقریب شائع ہوگی، اس میں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث ہے، اس لئے خیال ہوا کہ اس کو دیکھنے کے بعد پھر اس مسئلہ پر تنقید کی جائے، مگر ایک عرصہ گذرنے کے بعد وہ اب تک شائع نہیں ہوئی، اس لئے مجبوراً معارف کے ذریعہ اس کے متعلق بعض معروضات پیش کئے جاتے ہیں،

مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی ایک کہنہ مشق ادیب اور فاضل یگانہ ہیں، تاریخ پر ان کی نظر بڑی وسیع ہے، علمی دنیا اور قارئین معارف ان سے بخوبی واقف ہیں، ان کے مقالہ پر مجھ جیسے ہیچمدان کا قلم اٹھانا بڑی جسارت ہے، لیکن چونکہ محترم سید صاحب نے اپنے مقالہ جولائی ۵۲ء میں قوم گکھڑ کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے، اس پر دی

حیثیت سے اور مارچ ۱۹۶۹ء مین جو لکھا ہوا ہے، اس پر ذاتی حیثیت سے اپنے خیالات ظاہر کرنا ضروری ہے ان مقالات مین پانچ بنیادی مسائل ہین، اس لئے دیگر امور کو نظر انداز کر کے انہی پر کچھ عرض کرنا ہے، یہ مسائل حسب ذیل ہین،

۱۔ کیا گکھڑ قوم عہد افراسیاب مین داخلِ ہندوستان ہوئی ہے،

۲۔ راے زدہ دونی چند نے اپنی تصنیف کے گوہر نامہ مین واقعی سلطان شہاب الدین محمد غوری کی شہادت کا تذکرہ کیا ہے،

۳۔ کیا گل چند گکھڑ تھا، اور محقق اور مبین کے عہد مین ہندو مذہب رکھنے والے گکھڑ واقعی موجود تھے،

۴۔ لفظ گکھڑ کا اصلی املا کیا ہے،

۵۔ گکھڑون کے اسلام قبول کرنے اور کثرت سے قبول کی بیہودہ روایت بے بنیاد ہے،

معارف جولائی [illegible]ء مین جناب مولانا ابو ظفر صاحب نے لکھا ہے کہ جن مورخون نے لکھا ہے کہ گکھڑ قوم پہلی دفعہ محمود غزنوی کے ساتھ آئی، وہ یقیناً خلافِ واقعہ ہے کیونکہ فرشتہ نے تفصیل سے تحریر کیا ہے کہ پنجاب کے راجہ انند پال سے جب محمود غزنوی جنگ آزما ہوا، تو گکھڑ قوم انند پال کے ساتھ تھی، پھر اسی صفحہ پر ایک جگہ تحریر فرماتے ہین، لیکن صحیح ترین اور قرین قیاس وہ روایت مجھے معلوم ہوتی ہے، جو فرشتہ نے ابراہیم غزنوی کے حالات مین تحریر کی ہے، وہ لکھتا ہے کہ

[illegible]ء مین ابراہیم غزنوی پنجاب پہنچا، پہلے اجودھن، پھر قلعہ روپال کو فتح کیا، (اس قلعہ کو میرے خیال مین کشمیر کے پہاڑ راولپنڈی اور جموں کے درمیان ہونا چاہیئے) اس کے بعد وہ شہر دره کی طرف بڑھا، اس مین خراسانی نسل کے لوگ آباد تھے، وہ ان کے نام بانشندے اُن ترکش خراسانیون کی یادگار تھے، جو افراسیاب کے حملون کے باعث ہندوستان ہجرت کر گئے تھے، گو یہ شہر آباد تھا، لیکن باشندے بت پرستی مین مبتلا تھے، اس شہر مین ایک حوض تھا، [illegible]

جس کا قطر ایک میل تھا، اور اس کی گہرائی کا یہ عالم تھا کہ بالکل تہ نہ چلتا تھا، اس حوض مین پانی اس کثرت سے جمع ہوتا تھا کہ باوجود دیکہ حیوان انسان سب ہی سال بھر تک استعمال کرتے تھے، مگر کم نہ ہوتا تھا، شہر کے چارون طرف گنجان جنگل تھے، اس لئے شہر بھی دکھائی نہ دیتے تھے، میرے خیال مین یہ وہ گکھڑ تھے، جو کابل نہ گئے، اور اسی جگہ مقیم ہو گئے، جس کا ذکر آئے گا،"

فرشتہ کی تائید خود اس کتاب سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ مولف لکھتا ہے:-

"تاریخ بڈھالان مین لکھا ہے کہ ملک دھن جس جگہ آج آباد ہے، ایک زمانہ مین کشمیری ڈل کی طرح زیر آب تھا، بابر بادشاہ نے اس کو پسند کر کے آباد کرنے کا حکم دیا، ملک چند قانون گو اس کام کے لئے متعین کیا گیا، ان لوگون نے گھوڑی گالہ کی طرف سے پانی نکال ڈالا اور خشک ہونے پر کئی گاؤن آباد ہو گئے، اور گھوڑی گالہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ چند سوار اس کی گہرائی معلوم کرنے کے لئے اس مین گھس گئے لیکن چونکہ وہ خاصہ گہرا تھا، اور کیچڑ زیادہ، گھوڑی اس مین پھنس کر غرق ہو گئی، سوار بڑی مشکل سے جان بر ہوا، اسی لئے گھوڑی گالہ کے نام سے یہ مقام مشہور ہوا،"

پھر اگست [illegible]ء کے معارف ص ۱۱۹ مین تحریر کرتے ہین:-

"[illegible] کے ضمن مین فرشتہ نے سلطان ابراہیم کے شہر دره فتح کرنے کا حال لکھا ہے اس کا بیان ہے کہ یہ لوگ اہل دره خراسانی الاصل تھے، جن کو ترکون نے وہان سے نکال دیا تھا، میرا خیال ہے کہ یہ قطعی غیر مسلم گکھڑ تھے، اور جس تالاب کا ذکر کیا ہے وہ بابر کے عہد تک موجود تھا، یہ گکھڑون کے مختلف قبائل مین سے ایک تھا، ان کا سب سے بڑا سردار ھیال نامی تھا،"

اس طویل اقتباس کے پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ سید صاحب کے تمام دلائل پیش نظر ہو جائین،

اخبار نئی زندگی جہلم مورخہ ۸ دسمبر [illegible]ء مین میرے محترم اور فاضل دوست راجہ کفایت علی خان صاحب نوازادہ جند وٹ ضلع جہلم نے جو راجپوت گھرانے کے چشم و چراغ ہین" اور جن کو تاریخ

سے بڑا شغف ہے اور جن کی متعدد تاریخی تصانیف اُن کی وسعتِ معلومات کی شاہد ہیں، اپنے ایک مقالہ گھوڑی گالہ میں لکھتے ہیں،:-

"تحصیل چکوال کے مشہور پہاڑ دل جبا اور تحصیل جہلم کے پہاڑ ٹیلی کے درمیان ایک جگہ گھوڑی گالہ کے نام سے موسوم ہے"

اب یہ تو معلوم ہوگیا کہ گھوڑی گالہ تحصیل چکوال کے پہاڑ دل جبا اور جہلم کے پہاڑ ٹیلی کے درمیان واقع ہے، اور اس تمام علاقہ کی خصوصیت یہ نہیں ہے جیسا کہ فرشتہ نے بیان کیا ہے کہ سلطان ابراہیم کو برسات وغیرہ کی وجہ سے تین مہینہ تک تکالیف کا سامنا کرنا پڑا، اس علاقہ میں سردیوں میں زیادہ سے زیادہ بارش دو یا تین یوم تک رہتی ہے، یا اگر اس سے بھی غیر معمولی پڑے تو ہفتہ سے کبھی بھی زیادہ نہیں ہوتی لیکن ایسا شاذ ہی ہوتا ہے، اور گرمیوں میں تو ایک دن سالم بھی کبھی نہیں ہوئی، پھر مسلسل دو یا تین ماہ تک بارش کا ہونا اس علاقہ پر بالکل منطبق نہیں ہوتا، اس معاملہ میں سید صاحب مقامی حالات کی ناواقفیت سے غلط فہمی میں مبتلا ہوئے ہیں، فرشتہ کی تائید میں گھوڑی گالہ والی روایت کو تائید میں پیش کرنا بھی صحیح نہیں ہے، اور اس سے یہ بھی بخوبی ثابت ہوگیا، کہ خراسانی نسل کے باشندے یہاں مقیم نہ تھے، بلکہ کسی دوسری جگہ آباد ہوں گے، اب اس گتھی کا سلجھانا اور اس جگہ محلِ وقوع کا تعین جغرافیہ اور تاریخ کے ماہرین ہی کر سکتے ہیں، اب ایک اور حقیقت کا اظہار کر دینا بھی یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے، جس سے میرے دعوی کو تقویت پہنچتی ہے، وہ یہ ہے کہ گکھڑوں کی مردم شماری سنہ ۱۹۰۱ء میں ۲۰۱۰۱ تھی، بحوالہ گلوسری آف دی ٹرائب مؤلفہ سر ڈینزل ابٹسن گورنر پنجاب اور اس تعداد میں غزنویوں نے جو اسیرانِ جنگ گرفتار کئے، ان کی تعداد ایک لاکھ تھی، جن میں سے بیشتر شیر خوار تھے، اس سے ثابت ہوا، کہ یہ گکھڑ نہ تھے، اب چونکہ مولانا ابو ظفر صاحب کے ان خیالات کی تاریخی حقائق و شواہد سے تردید کی جا چکی ہے، کہ خراسانی نسل جن کو افراسیاب نے جلاوطن کیا تھا، گھوڑی گالہ کے علاقہ میں آباد نہ تھے، اور نہ یہ خراسانی نسل کے گکھڑ تھے،

ان سے اس پر کچھ لکھنا بے سود ہے، البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر گکھڑ کب ہندوستان آئے، یا وہ ہندوستانی نژاد ہیں، گکھڑوں کا زمانہ قدیم سے یہ دعویٰ ہے کہ وہ سلطان محمود غزنوی کی معیت میں وارد ہندوستان ہوئے اور ان میں ہمارے مورثِ اعلیٰ گکھڑ شاہ کو یہاں کا تمام علاقہ انتظام کے لئے سپرد کیا، دراصل یہ قوم ایرانی الاصل ہے ابھی ہمارے درباری مؤرخ کے گوہر نامہ کے مصنف کا بھی بیان ہے، اور سیر المتاخرین کے مؤلف نے بھی اپنی تاریخ میں ولایتِ گکھران کی نحیابلی کے عنوان کے ماتحت حسب ذیل سطور تحریر کی ہیں کہ:

"یہ ولایت سندھ اور بہت کے درمیان واقع ہے، وہاں کے حاکم ہمیشہ اسی قوم کے رہے ہیں، اور کسی بادشاہ کی اطاعت نہیں کرتے بعضوں نے لکھا ہے کہ قدیم سے یہ ولایت کشمیر میں داخل تھی سلطان محمود غزنوی نے اس کو فتح کر کے اپنے ایک امیر کے سپرد کی، اُس وقت سے اُس کی نسل گکھر مشہور ہوئی"

محولۂ بالا اقتباس سیر المتاخرین کے اردو ترجمہ مرآۃ السلاطین جلد اول مطبع نولکشور مطبوعہ سنہ ۱۸۸۱ء کے ص ۱۹۶ میں ہے، نیز سیر المتاخرین کے اس فقرہ سے کہ "بعضوں نے لکھا ہے" یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بعض قدیم مورخین بھی صاحب سیر المتاخرین کے ہم خیال ہیں،

مولانا سید ریاست علی صاحب ندوی بھی اس کے مؤید ہیں، جس پر ان کا مقالہ شائع شدہ معارف جون سنہ ۲۲ء شاہد ہے،

سید ابو ظفر صاحب نے خود بھی جولائی سنہ ۲۲ء میں اس امر کا اعتراف کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:-

"جن مؤرخوں نے یہ لکھا ہے کہ گکھر قوم بھی سلطان محمود غزنوی کے ساتھ آئی، وہ یقیناً غلط فہمی میں مبتلا ہیں، کیونکہ فرشتہ نے تفصیل سے تحریر کیا ہے کہ انند پال راجہ پنجاب سے محمود غزنوی جنگ آزما ہوا، تو گکھر قوم انند پال کے ساتھ تھی"

فرشتہ کے بیان کی تردید خود سید صاحب نے بھی اپنے ایک مضمون میں کی ہے، جو انھوں نے میرے

ایک عریضہ کے جواب مین جو معارف ۱۹۴۹ء مین لکھا تھا، اس مین وہ رقمطراز ہین:-

"میرے اس بیان سے معلوم ہو گیا کہ واقعی فرشتہ اپنے بیان مین منفرد ہے، اور تاوقتیکہ اس کی تائید کسی دوسری تاریخ سے نہ ہو یقینی نہین کہہ سکتے، فرشتہ کے تین نسخے میرے پاس موجود ہین، حیدرآباد کے نسخہ مین "گکھر" لکھا ہے، دوسرا نولکشور جس مین "کھکر" تحریر ہے، تیسرا ۱۹۲۶ء غالباً سہو کتابت سے ہجری کی بجائے عیسوی تحریر کیا ہے، جو بمبئی کے انگریز کیپٹن کے زیر تحت طبع ہوا ہے، اس مین بھی "کھکر" ہی لکھا ہے، پس ممکن ہے کہ یہ لفظ کھوکر کا مفرس ہو"۔

سید صاحب کی اس تحریر سے معلوم ہوا کہ انھون نے فرشتہ ہی کے بیان کی بنیاد پر محمود کے ہمراہ گکھڑون کے ہندوستان مین آنے سے انکار کیا تھا، اور جب میرے توجہ دلانے پر دوبارہ تحقیقات کی تو بجز فرشتہ کے اُن کو کسی اور تاریخ مین یہ روایت نہیں ملی، اس لئے یقین ہے کہ اب ان کو اس بات کے تسلیم کرنے مین کوئی عذر نہ ہوگا، کہ جن مورخون نے گکھڑ قوم کا محمود کے ساتھ ہندوستان مین داخل ہونا بیان کیا، انھی نے صحیح حقیقت بیان کی ہے جس مین شک و شبہہ کی کوئی گنجایش نہین ہے،

بعض انگریز مورخین نے بھی گکھڑون کو ایرانی الاصل تحریر کیا ہے، راجہ شیر محمد خان جنجوعہ مرحوم جو کہ ہری جو مدت العمر تاریخ جنجوعہ اور گکھڑ کا مطالعہ کرتے رہے، انھون نے ایک دفعہ مجھے بتایا تھا کہ مجھے اب ٹھیک یاد نہین، یا پنجاب چیفس سر لیپل گریفن مین ہے یا رپورٹ بندوبست اول ضلع راولپنڈی مین ہے مرزا کالا خان دریک کا بیان ہے کہ سلطان محمود نے کھوکھرون کو شکست دینے کے بعد نیلاب مین اپنے سرداران مین ایک سردار کو افسر مقرر کیا، سردار موصوف سردار سکندر حیات مرحوم سابق وزیر اعظم پنجاب کی برادری کے بزرگون مین سے ہوئے ہین،

مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی نے راجہ سردار علی خان کے جواب مین مئی ۱۹۴۲ء کو حسب ذیل گرامی نامہ تحریر فرمایا،

مکرم بندہ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

رجسٹری ملی، یاد آوری کے لئے مشکور ہون، تاریخ اور مقدمہ دونون مکمل ہو کر پریس مین جانے والے ہین، ایک مقالہ معارف مین بھیج دیا ہے، شائع ہونے پر آپ کے تمام سوالون کے جواب مل جائینگے، کیانی النسل ہونا اور ہندو ہونا دو متضاد شئے نہین ہین، دونون ہو سکتے ہین، گو کسی دوسری تاریخ سے کیانی النسل ہونے کی تائید نہین ہوتی، لیکن تردید بھی نہین ملی، اور اگر واقعہ صحیح ہو، تو کوئی عجیب بات نہین ہے، آج ہارون الرشید خلیفہ بغداد کی نسل سے عباسی ہندوستان مین بہت ہین، سلطان محمد تغلق کے نسلی افراد پرانا قلعہ دہلی مین موجود ہین، آپ کے پاس فارسی جو تاریخ ہے اس کا نام اور مصنف کا نام جلد تحریر فرمائین تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ میرے پاس بھی ہے یا نہین، اور انگریزی تاریخ کا بھی نام اور مصنف کا نام بھی لکھین، اپنی قوم کے نام کا املا بھی لکھین، کتابون مین یہ لفظ "گکھڑ" ملتا ہے، کیا آپ لوگ گکھڑ لکھتے اور لکھتے ہین،

حقیر سید ابوظفر ندوی

کیانی النسل ہونا، اور ہندو ہونا، دو متضاد باتین ہین، آپ فرماتے ہین، کیانی النسل ہونے کی تائید کسی تاریخ سے نہین ہوتی، تو اس کی تردید بھی نہین ہوتی، اب جب کہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ گکھڑ سلطان محمود کے ساتھ وارد ہندوستان ہوئے، اور اُن کے درباری مورخ دونی چند نے ان کا کیانی النسل ہونا بیان کیا ہے جو اس نے خود اور دوسرے گکھڑون سے سنا ہوگا جسکو وہ اپنے بزرگون سے نسلاً بعد نسلٍ سنتے چلے آئے تھے، اس لئے اسکو صحیح ماننے کی کوئی وجہ نہین ہے، خصوصاً جب اس کے خلاف کوئی ثبوت نہین ملتا، تو پھر اس کے تسلیم کرنے مین کیا امر مانع ہو سکتا ہے، خاکسار کے ایک عریضہ کے جواب مین مولانا ابوظفر صاحب نے معارف ماہ جنوری ۱۹۵۵ء مین جو مقالہ تحریر کیا تھا، اس مین ایک جگہ راقم کے خطاب کو منضبط کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ

"میرے دوست جناب اکرم خان صاحب نے ایک فقرہ لکھا ہے کہ اصولی لحاظ سے بھی محمود کے ہمراہ گکھڑ

کے مورخ کی روایت کی کوئی حقیقت نہیں"

اگر اس قسم کے اصول صحیح تسلیم کرئے جائین تو پھر تاریخ طبری، کامل، ابن خلدون، طبقاتِ ناصری، تاریخ الفی، بدایونی، آئینِ اکبری، ان مین سے کوئی معتبر نہ رہے گی، اس لئے یہ اصول صحیح نہین، کہ مدت کے بعد جو تاریخ لکھی جائے، اسکی روایت صحیح نہ تسلیم کیجائے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کا ماخذ کیا ہے، اور وہ صحیح مستند، قریب العہد یا شاہد عینی ہے یا نہین، اور پھر اس کے معاصر یا قریب العہد مورخ اُس کے مؤید ہین یا نہین،

اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ وہ اصل خط جو ناچیز نے ادارہ کی معرفت مولانا ابوظفر صاحب کو تحریر کیا تھا، اسکی نقل تحریر کردی جائے، جو حسب ذیل ہے،

مکرم زاد لطفکم:- السلام علیکم،

موقر جریدہ معارف جولائی و اگست ۱۹۵۱ء میں کے گوہر نامہ المعروف گکھڑ نامہ پر مولانا ابوظفر صاحب ندوی نے ایک تنقیدی مقالہ تحریر کیا، مین اس تنقیدی مقالہ پر کچھ لکھنا چاہتا تھا، احباب بھی اصرار کرتے ہین، کہ اس پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھنا چاہیئے، کیونکہ اس مقالہ نے چند غلط فہمیون کا اضافہ کر دیا ہے، اگرچہ صاحب مقالہ ایک فاضل مجتہد ہین اور ایک گکھڑ کی فرمایش پر گکھڑ نامہ کا اردو ترجمہ اور اس پر ایک تنقیدی مضمون معارف مین شائع کیا ہے؛

لیکن گردش زمانہ نے اب تک اس کی فرصت نہ دی، انشاء اللہ آیندہ کبھی اس پر گفتگو کی جائیگی؛ مولانا موصوف نے اپنے مقالہ مین بحوالہ فرشتہ تحریر کیا ہے، کہ گکھڑون نے معمولی فوج سے مقابلہ کیا، اور تین چار ہزار مسلمان شہید ہوگئے، کیا واقعی گکھڑون نے محمود کی فوج سے مقابلہ کیا تھا، فرشتہ کا مطبوعہ نسخہ بہت غلط چھپا ہے، اُس کی منفرد روایت قابلِ قبول نہین ہوسکتی، اصولی لحاظ سے بھی محمود کے چھ سو برس بعد کے مورخ کی روایت قابلِ استناد نہین ہوسکتی، تعجب ہے کہ مولانا جیسے وسیع النظر مورخ نے محمود کی معاصر اور قریب العہد مورخین کی مستند تاریخون کو نظرانداز کرکے فرشتہ کو کیون ترجیح دی، اس لئے یہ روایت بالکل

بے بنیاد ہے، اس کی کوئی حقیقت نہین، گکھڑ قوم محمود کی ہمراہی مین ہندوستان آئی، اس لئے ازراہ کرم طبقاتِ بیہقی، ابن اثیر، طبقاتِ ناصری، تاریخ الفی، طبقاتِ اکبری، بدایونی، الغرض کسی مستند تاریخ کے حوالہ سے تحریر کیا جائے کہ معمولی فوج سے لڑائی کھوکھرون نے کی تھی، یا گکھڑون نے، امید واثق ہے کہ آیندہ معارف مین اس پر مفصل مقالہ مع مستند حوالہ جات شائع فرماکر ممنون فرمادین گے" تاکہ ایک بڑی غلط فہمی کا ازالہ ہوسکے،

اب ناظرین خود ہی فیصلہ کرلین کہ میرا یہ عرض کرنا کس قدر صحیح تھا کہ اصولی لحاظ سے چھ سو برس بعد کے مورخ کی روایت کی کوئی حقیقت نہین، یہ جس اصول کی دعوت سید صاحب نے دی تھی، خاکسار نے بھی اسی کی طرف اُن کی توجہ منعطف کرائی تھی، مگر انھون نے خاکسار کے عریضہ کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا، پھر اسی مقالہ پر ایک جگہ آپ فرماتے ہین کہ

"میرے مکرم دوست نے یہ بھی لکھا ہے کہ گکھڑ محمود کی معیت مین وارد ہند ہوئے لیکن کسی تاریخ مین میری نظر سے نہین گذرا کہ یہ قوم محمود کے ساتھ ہندوستان آئی، سوائے آئینِ اکبری کی ایک شاذ روایت کے، جس کی کسی تاریخ سے تائید نہین ہوتی، اور بقول آپکے چھ سو برس بعد کے مورخ کی روایت کس طرح صحیح تسلیم کی جائے؟"

اب اس پر سیر حاصل تبصرہ ہوچکا ہے، مزید استشہاد کی ضرورت باقی نہین رہی،

کیا رائے زادہ دونی چند نے اپنی تصنیف گکھڑ نامہ مین واقعی سلطان شہاب الدین محمد غوری کی شہادت کا تذکرہ کیا ہے؟

سلطان شہاب الدین غوری کی شہادت پر خاکسار کے استفسار پر جو فاضلانہ مقالہ مولانا سید ریاست علی صاحب ندوی کا معارف جون ۱۹۲۳ء مین شائع ہوا تھا، اس مین موصوف نے قوم گکھڑ کو سلطان کے قتل سے بے تعلق قرار دیا تھا، اور قاتل کھوکھرون اور فرقہ اسماعیلیہ کی متحدہ سازش کا نتیجہ قرار دیا تھا، اگرچہ اس پرمغز مقالہ مین کسی شک و شبہہ اور ترمیم و اضافہ کی مطلق گنجایش نہ تھی، لیکن مولانا سید ابوظفر صاحب نے معارف اگست ۱۹۲۳ء مین سلطان شہاب الدین غوری کی شہادت کے سلسلہ مین اس بات کو تو تسلیم کیا

کو فرشتہ کی منفرد روایت ہے اور تمام مورخین متفق ہیں کہ یہ کام کھوکھرون نے کیا، اور فرشتہ دکن میں مستقل
سکونت پذیر ہونے کی وجہ سے گکھڑون اور کھوکھرون میں فرق نہ کر سکا، اس کے برخلاف بدایونی نے دونون
قومون کو الگ کرکے تحریر کیا ہے، پھر آپ لکھتے ہیں کہ کتابت کی غلطیان بھی غلط فہمی کے لئے معاون ہوتی ہیں
لیکن طباعت سے قبل جو نسخے اُس وقت تھے، اُن میں بھی ان دونون قومون کی تفریق نہ تھی، اور اس لئے
تاریخ گکھڑ کے مؤلف نے بھی اس کو کھوکھر کی بجائے گکھڑ ہی پڑھا، حالانکہ وہ فرشتہ سے قریب تر زمانہ یعنی محمد
۱۱۳۰ھ کے عہد میں تھا" اسی اگست کے پرچہ میں ایک جگہ گکھڑون کے اسلام کے عنوان کے تحت مولانا نے تحریر
کیا ہے کہ

"غالباً اس کے عہد تک زبانی روایت یہی تھی کہ سلطان کو گکھڑون نے شہید کیا، لیکن مؤلف
کو خود اس کا یقین نہین ہے، اسی لئے اُس نے آخر میں وُاللہ اَعْلَم بالصّواب کا اضافہ کر دیا"

اسی مضمون میں مولانا نے فرشتہ کی تاریخ تالیف ۱۰۱۵ھ ۱۰۱۸ھ تحریر کی ہے، جو درست نہیں ہے،
مولانا سید احمد اللہ صاحب قادری حیدر آباد دکن نے ایک مقالہ مطبوعہ معارف جنوری ۱۹۳۶ء فرشتہ کا عہد
تصنیف میں فرشتہ کے اقتباسات سے ثابت کیا ہے کہ تاریخ فرشتہ کی تالیف ۱۰۳۳ھ تک جاری رہی، بلکہ
ممکن ہے کہ اُس کے بعد بھی جاری رہی ہو جس سے ہم لاعلم ہین، ہمارے فاضل دوست کو یہان سخت
غلط فہمی پیدا ہوئی ہے، رائے زادہ دونی چند نے اپنی کتاب کیگوہر نامہ واقعی ۱۱۳۶ھ مین تصنیف کی
تھی، اس مین سلطان شہاب الدین محمد غوری کے قتل کا کوئی تذکرہ نہین، اس کے بعد اس کے لڑکے رائے
زادہ برج ناتھ نے سلطان مکرم خان کے حکم سے تاریخ وجہ تسمیہ دیہات دان گلی و پھرالہ ۱۱۶۰ھ مین
تحریر کی جو نہایت قیمتی اور پراز معلومات کتاب ہے، اس مین موضع دھمک کا بھی جہان سلطان کی
شہادت بیان کی جاتی ہے، ذکر ہے لیکن اُس نے بھی قتل کا مطلق ذکر تک نہین کیا، ایک اور کتاب تاریخ
دھمیالان اسی خانوادہ سے تعلق رکھنے والے ایک شخص رائے زادہ بودھا مل ولد رائے زادہ موتی چند نے

۱۲۱۱ھ مین تصنیف کی ہے، یہ کتاب قوم دھمیالان کے مورثِ اعلیٰ اور بانی موضع دھمک کی تاریخ ہے،
اس مین بھی سلطان کی شہادت کا کوئی ذکر نہین ہے، البتہ رائے زادہ رتن چند نے جو رائے زادہ دونی
چند کا پوتا تھا، سلطان کے قتل کی وہ روایت بیان کی ہے جس کا تذکرہ میرے محترم دوست نے کیا ہے،
رائے زادہ رتن چند نے اپنی کتاب اور رائے زادہ موتی چند کی کتاب مین خلط ملط کر دیا ہے، جس سے مولینا
کو غلط فہمی پیدا ہونی لازمی تھی، جن لوگون نے رائے زادہ دونی چند کی اصل کتاب دیکھی ہے، وہ اُسے
بخوبی جانتے ہین، خاکسار کے پاس دونون کے نسخے موجود ہین، رائے زادہ رتن چند انگریزی عہد تک
اپنی تاریخ کی تکمیل کرتا رہا ہے، جس کو سید ابو ظفر صاحب نے بھی تسلیم کیا ہے، اصل حقیقت یہ ہے کہ رائے زادہ
رتن چند نے تاریخ فرشتہ کا وہی مطبوعہ نسخہ جس مین کتابت کی بے شمار غلطیان ہین، دیکھا تھا، اس لئے
اُس نے سلطان شہاب الدین کے قتل کے متعلق اسی کا اقتباس اپنی تاریخ مین درج کر دیا، اور اسی پر قبول
سید صاحب اپنے عدم اعتماد کا اظہار بھی کر دیا، اگر فرشتہ کے مطبوعہ نسخہ سے پہلے اس واقعہ کی کوئی ذرا بھر
بھی اصلیت ہوتی، تو رتن چند کے پیشرو بھی اس کا ذکر اپنی تصانیف مین کرتے، کیونکہ بعض وجوہ سے اُن
کا بیان کرنا بھی ضروری تھا، لیکن انھون نے اس کا کوئی تذکرہ نہین کیا، جس سے اس بے سر و پا فسانہ
کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے،

امید ہے کہ میری ان تصریحات کی روشنی مین جناب سید صاحب کو یقین ہو گیا ہوگا کہ فرشتہ کے مطبوعہ
نسخہ کی غلط طباعت و اشاعت ہی سے تاریخی دنیا مین غلط فہمی پیدا ہوئی، اور جو تاریخین اُس کے بعد لکھی
گئین، انھون نے اسی کو ماخذ قرار دیا، بالخصوص انگریزی مورخین سر لیپل گریفن، ڈل میرک ٹامسن وغیرہ
اس غلط فہمی کا شکار ہوئے، اور جن انگریز یا دوسرے مورخین نے فرشتہ کی تاریخ کی اشاعت سے پہلے
اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے، وہ اس غلط فہمی مین مبتلا نہین ہوئے، اس کی ایک مثال بھی موجود نہین
ہے، اتنے دلائل کے بعد اس مسئلہ پر مزید خامہ فرسائی بے کار ہے، ورنہ میرے پاس اس ضمن مین کافی

مواد موجود ہے کہ دوآبہ سندھ ساگر پر عرصۂ دراز تک قوم کھوکھر حکمرانی کرتی رہی، جس کا عمل دخل سلطان محمود سے بھی بہت پہلے تھا، اس دوآبہ کا مشہور شہر آسونی کوٹ قوم کھوکھر کا دارالحکومت تھا، جو باجل النند کہلاتا تھا، موجودہ موضع دھمک تحصیل جہلم میں سلطان شہاب الدین محمد غوری کی شہادت بھی مشتبہ معلوم ہوتی ہے، اور بعض حقائق تاریخی کے خلاف ہے، خاکسار نے اس مسئلہ کی بڑی تحقیق کی ہے، اگر زندگی نے وفا کی، تو انشاء اللہ اس پر مفصل روشنی ڈالی جائے گی،

ایک عرصہ تک میں بھی اسی دھمک میں سلطان کی شہادت کا قائل تھا، اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ دھمک ہو یا کوئی دوسرا مقام اس سے اصل مسئلہ میں کوئی فرق نہیں آتا، یہ بھی ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ رائے زادہ برج ناتھ نے رائے زادہ دونی چند کے کیگوہر نامہ کا تتمہ نہیں لکھا، بلکہ یہ ایک مستقل تصنیف ہے، جس کا موضوع جدا ہے، یہ کتاب اپنے موضوع پر نادر ہے، مگر اب نایاب ہے، یہ صحیح ہے کہ رائے زادہ تن چند نے کیگوہر نامہ رائے زادہ دونی چند کا بھی تکملہ لکھا ہے، لیکن اس کے بعض نسخے بلا تکملہ کے بھی ہیں، جو بعض علم دوست گھرانوں میں موجود ہیں، میرے پاس جو نسخہ ہے، وہ میرے فاضل دوست راجہ کفایت علی خان صاحب پنوار آف جند وٹ ضلع جہلم کے نسخہ کی نقل ہے، جس کو ان کے پردادا چودھری شاہ باز مرحوم نائم سردار جبر سنگھ ناری نے میاں ابراہیم صاحب ساکن موضع کینت تاج خان سے ۱۲۴۳ھ میں نقل کرایا تھا، یہ اغلباً خاندان گکھڑ نہ سے نقل کیا گیا ہوگا،

اس میں علاقہ پچھوار کی وجہ تسمیہ اور اس کے جملہ دیہاتوں کے حالات مع وجہ تسمیہ کے بیان کئے گئے ہیں، کیگوہر نامہ مؤلفہ رتن چند تو بہت آدمیوں کے پاس ہے، مگر کیگوہر نامہ دونی چند کے نسخے کمیاب ہیں، اور تاریخ وجہ تسمیہ دیہات مؤلفہ رائے زادہ برج ناتھ تو نایاب بلکہ ناپید ہے، مگر اس کا ایک نسخہ خاکسار کے پاس موجود ہے،

کی جگہ چند گکھر تھا اور وہ بھی عہد التمش اور بلبن میں ہندو مذہب رکھنے والے گکھر موجود تھے

محترم سید ابو ظفر صاحب معارف مارچ ۱۹۴۹ء میں رقمطراز ہیں، کہ میری کتاب کیگوہر نامہ مکمل ہو چکی ہے، تقریباً اٹھارہ بیس کتابوں سے حاشیہ میں اصل کتاب کی تائید یا تردید کی ہے، اس کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ التمش اور بلبن کے عہد تک گکھڑ قوم میں ہندو مذہب رکھنے والے لوگ موجود تھے جن میں سے ایک کا نام گل چند تھا، بدایونی میں بھی اس کے والے ملتے ہیں، یہاں بھی میرے فاضل دوست کو غلط فہمی پیدا ہوئی، گل چند کھوکھر تھا نہ گکھر تھا، اس کی تردید سے پہلے آپکے اس استفسار کے اس حصہ پر یہاں نظر ڈال لی جائے، جس میں آپ نے فرشتہ کی اس غلط بیانی کا ذکر کیا ہے کہ اس نے سلطان کے قاتلوں میں کھوکھروں کی بجائے گکھروں کا نام لیا ہے تاکہ فرشتہ کے بیان سے سلطان کے قاتلوں میں ایک نئی جماعت کے نام کا اضافہ نہ ہو جائے، یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ تاریخ فرشتہ کا مطبوعہ نسخہ بہت غلط چھپا ہے، اس لئے اس میں کھوکھر اور گکھڑ میں امتیاز نہیں رہ سکا ہے، مختلف مقاموں میں جہاں گکھڑ ہونا چاہئے، کھکر چھپا ہے، مثلاً ص ۱۸۴ میں سلطان آدم گکھڑ کے بجائے کھکر کہا گیا ہے، اسی طرح ص ۲۴ میں جہاں تلک چند سردار کھوکھر کی بغاوت کا ذکر ہے، کھکر چھپ گیا ہے،

اسی طرح ص ۱۳۷ میں جہاں جسرت کھوکھر کے لاہور کے صوبہ دار کو مارنے کا ذکر ہے، وہاں بھی کھکر ہی ہے، اس کے برخلاف بدایوں وغیرہ میں کھوکھر اور گکھر کے فرق کا لحاظ ہر جگہ موجود ہے، مثلاً جسرت کھوکھر جلد نمبر ۱ ص ۲۰۹ گل چند کھوکھر جلد نمبر ۱ ص ۲۳۱، اور گکھڑوں کو کھکر لکھا گیا ہے، جیسے سلطان آدم کھکر جلد نمبر ۱ ص ۲۹۱ بہ سبر کھکران جلد نمبر ۱ ص ۳۸۸، آدل پناہ بہ کھکران جلد نمبر ۱ ص ۳۸۶ وغیرہ، یہ سمجھنا کہ بدایونی نے ان دونوں قوموں میں امتیاز کیا ہے، اور تاریخ فرشتہ نے جو چند سال بعد تکمیل کو پہنچی دونوں کو خلط ملط کر دیا ہے، قیاس سے دور ہے، اس لئے قیاس ہے کہ طباعت کے وقت کاتب کے قلم سے سہو ہوا، اور وہ کھوکھر اور کھکر میں امتیاز نہ رکھ سکا، اور اس ایک غلطی سے ایک قوم کا پورا بار گناہ

دوسری قوم کے سر آگیا، اس لئے جن لوگوں کے متعلق سید صاحب کا گمان ہو سکتا ہے کہ وہ گکھڑ ہیں، اور ہندو مذہب رکھتے تھے، وہ تمام ہی کھوکھر ہیں، ان میں سے کوئی بھی گکھڑ نہیں ہے، گکھڑ سلطان محمود کے ہمراہ بحیثیت مسلمان ہندوستان وارد ہوئے، التمش یا بلبن وغیرہ کے عہد میں ان کا کوئی آدمی ہندو نہیں تھا،

لفظ گکھڑ کے املا کی حقیقت

سید ابو ظفر صاحب نے اپنے مضامین جولائی و اگست ۱۹۲۸ء اور مارچ ۱۹۲۹ء میں لفظ گکھڑ کے بجائے جا بجا اُس کو گکھڑ تحریر کیا ہے، جو بالکل غلط ہے، لفظ گکھڑ درست ہے، موصوف نے جو مکتوب برادرم راجہ سردار علی خان صاحب آف ملوٹ کو تحریر کیا تھا، اُس میں بھی انھوں نے اُن سے اپنی قوم کے نام کا املا دریافت کیا تھا، روزمرہ کی بول چال اور تحریر میں گکھڑ کی بجائے گکھڑ ہی بولا اور لکھا جاتا ہے، اس میں عوام تو درکنار اہلِ نظر تک غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اس لئے اس کے املا میں احتیاط کی ضرورت ہے،

گکھڑوں کے اسلام قبول کرنے اور کثرتِ بعول کی روایت بے بنیاد ہے

معارف اگست ۱۹۲۸ء میں مولانا سید ابو ظفر صاحب نے گکھڑوں کے اسلام قبول کرنے کی روایت فرشتہ کے حوالہ سے بیان کی ہے، جسے پڑھ کر بیحد صدمہ ہوا، کاش وہ اس بے سرو پا داستان کو لکھنے سے پہلے اس پر غور کر لیتے کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں، اس پر طرہ یہ کہ اسی پرچہ کے ص ۱۲۱ کے حاشیہ پر یہ تحریر کیا ہے کہ

"قدیم ہندو قوم میں یہ رسم عام تھی، ہندوستان کا ہر مورخ اس کو جانتا ہے، اور میں نے سنا ہے کہ تبت میں آج بھی اُس کا رواج بعض جگہ موجود ہے، اس لئے یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے، کیونکہ گکھڑ تبت سے آئے، جہاں اس کا عام رواج تھا، جیسا کہ تاریخوں میں مذکور ہے"

شاید اس تحریر سے اُن کو اپنے رفیق ہمدم راجہ گلزار خان کے ساتھ ہمدردی مقصود ہو کہ اُن کو ایک ایسی سند مل جائے، جو ہمیشہ قائم رہے، مجھے افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ مولانا نے اپنے دوست کی

قومی تاریخ کا دیباچہ خوب ہی لکھا ہے اس کو لکھتے وقت انھوں نے یہ نہ سوچا کہ اس سے اس غیور اور بہادر قوم کے ہزارہا افراد کے جذبات کو سخت ٹھیس لگے گی، اور وہی طرزِ عمل اختیار کیا، جو بقول علامہ شبلی نعمانی مرحوم لین پول نے عالمگیر کے ساتھ کیا تھا، اب دیکھنا یہ ہے کہ اس بیان کی حقیقت بھی ہے، یا محض گپ ہے، اور فرشتہ کی نفس طبع کی ایجاد ہے، اس سے پیشتر یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ سلطان محمود کے ساتھ گکھڑ ہندوستان میں آئے، اور سلطان شہاب الدین کو کھوکھروں نے قتل کیا تھا، اس کے بعد اس بیان کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی کہ گکھڑ سلطان شہاب الدین کے عہد میں مسلمان ہوئے، لطف یہ ہے کہ یہاں بھی وہ اپنے تمام ہمعصروں سے منفرد ہے، اور کسی دوسری تاریخ سے اس لغو اور من گھڑت داستان کی تائید نہیں ہوتی، یہ کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ جس زمانہ کی تاریخ لکھی جا رہی ہے، اس زمانہ یا اُس کے قریب العہد مورخوں نے تو اس واقعہ کو نہیں لکھا، اور طویل عرصہ گذر جانے کے بعد ایک مورخ بلا سند اس کو بیان کرتا ہے، ایسی حالت میں یہ بیان کس طرح قابلِ قبول ہو سکتا ہے، جب تک ہم عصر یا قریب العہد مورخین کے بیان سے اس کی تائید نہ ہو، رہی تبت کی داستان تو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ اگر گکھڑ تبت سے ہندوستان آئے تھے، تو تبتیان میں یہ نقائص اور خرابیاں پائی جاتی تھیں، مگر اپنے محترم دوست کی واقفیت کے لئے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس قوم میں قدیم الایام سے یہ دستور چلا آتا ہے کہ کسی دوسری قوم کے معزز سے معزز شخص کو بھی اپنی لڑکی نہیں دیتے، بلکہ اس بارہ میں اتنی سختی ہے کہ گکھڑوں کی مختلف گوتیں دوسری گوت میں رشتہ نہیں کرتیں، مثلاً سکندرال، گگیال، فیروزال، سارنگال، آدمال، ایک دوسرے میں شادی بیاہ نہیں کرتے، اگر کوئی شخص کسی مصلحت سے ایسا کرنا چاہے تو وہ کتنا ہی معزز ہو، اس کو برادری بڑی عبرتناک سزا دیتی ہے، بعض دفعہ تو ایسے مواقع پر خونریزی تک کی نوبت پہنچ جاتی ہے، ایسی غیور، خود دار، اور بہادر قوم پر ایسے الزامات عائد کرنا صریح ظلم ہے، اسی اگست کے پرچہ میں سید ابو ظفر صاحب نے بحوالۂ فرشتہ گکھڑوں کے مسلمان ہونے کی روایت بیان کر کے اپنی رائے سے انکی تعداد ۱۰ لاکھ بتائی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں کہ

فرشتہ نے گکھڑوں کے اسلام قبول کرنے کے حالات تحریر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ

شہاب الدین غوری اسی سال تیراہ کی طرف گیا، جو غزنہ اور پنجاب کے درمیان مین ہے، اور وہان کے لوگون کو بھی نرمی اور گرمی سے اپنا فرمانبردار بنا کر اسلام مین داخل کیا، اور ان دونون قومون کی تعداد تقریبًا چار لاکھ تھی، اس وقت تیراہ کا علاقہ پہاڑی ہے، اس مین اس قدر سرسبزی اور شادابی نہین جس قدر دوآبہ جلم، ڈھار مین ہے، اس لئے ضرور ہے کہ یہان کی آبادی تیراہ سے زیادہ ہو، لیکن بالفرض نصف ہی مان لین، تب بھی غوریون کے عہد مین وہ دو لاکھ کی تعداد شمار مین آتی، جس کا فرشتہ کا ذکر ہے، حالانکہ اب یعنی ۱۹۳۱ء مین بھی ان کی تعداد ہزارون سے متجاوز نہین ہے، جس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ وہ گکھڑ نہ تھے،

حیرت ہے کہ ایک طرف تو سید صاحب نے خراسانی نسل کے لوگون کو جنھین افراسیاب نے جلاوطن کیا تھا، گکھڑ بتاتے ہین، اور دوسری طرف فرشتہ کی بیہودہ اور من گھڑت فسانہ کو صحیح مانتے ہین، حالانکہ ان دونون مین تضاد ہے، خراسانی نسل کے لوگ کسی بیگانہ سے پیوند نہین کرتے، اور وہ مذہبًا آتش پرست تھے، اور فرشتہ نے سلطان شہاب الدین غوری کے عہد مین جس قوم کے مسلمان ہونیکی روایت بیان کی ہے اسکے متعلق لکھا ہے کہ وہ کسی خاص مذہب کی پابند نہ تھی، لڑکیان فروخت کرتی تھی وغیرہ، کیا ان دونون روایتون مین کسی قسم کی نسبت ہو سکتی ہے، ان تصریحات سے حقیقت حال پوری واضح ہو گئی، اس کے بعد مزید دلائل و شواہد کی ضرورت نہین ہے، تبت مین گکھڑ اگر رہے ہین، تو بحیثیت حکمران کے، اور ایسی بیہودہ رسم کسی حکمران غیور اور جسور قوم مین نہین پائی جا سکتی،

آخر مین ایک اور بات عرض کر دینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ فرشتہ نے جو داستان بیان کی ہے، وہ اس کی طبع زاد ہے، ایسی کوئی قوم اس علاقہ مین موجود نہ تھی، اور اگر ہو سکتی ہو تو وہی جو عہد شہاب الدین مین مسلمان ہوئی، اور یہ قوم کھوکھر ہے، لیکن یہ نہایت بہادر اور غیور قوم تھی، کسی بہادر اور نامور قوم

کو اس قسم کے الزامات سے متہم کرنا کس قدر ظلم ہے، تبت مین آباد ہونے سے ان مین ان برائیون کا پیدا ہونا لازمی نہین ہے، خصوصًا جب کہ مولانا یہ بھی مانتے ہین، کہ صرف بعض جگہ اس کا رواج تھا، گویا تمام تبت مین نہین تھا، پھر یہ بھی تحقیقی طور پر معلوم نہین کہ کس زمانہ مین یہ رسم تھی، لیکن بالفرض اگر کسی زمانہ مین تھی بھی تو یہ مسلم ہے کہ ایک ہی شہر یا ملک مین نیک معاش اور بد معاش ہر قسم کے لوگ رہتے ہین، نہ سارا ملک فرشتہ سیرت بن سکتا ہے اور نہ تمام ملک کے باشندے بد سیرت ہو سکتے ہین،

راقم نے اس مضمون مین حتی الامکان سید صاحب کا پورا احترام ملحوظ رکھنے کی کوشش کی ہے تاہم اگر کوئی فقرہ ان کے خلاف شیع قلم سے نکل گیا ہو تو وہ اس کے لئے معذرت خواہ ہے.

شایقین کو موصوف کے ترجمہ کے گوہر نامہ کی اشاعت کا بڑا انتظار ہے اس لئے امید ہے کہ وہ جلد اس کو شایع کرنے کی کوشش کرین گے، بہتر ہوتا کہ گکھڑون کے متعلق فارسی اور انگریزی تاریخون مین جو حالات ملتے ہین ان سب کا ترجمہ بھی بطور ضمیمہ کے اس کتاب کے ساتھ شایع کر دیا جاتا اس سے اس کی افادیت بہت بڑھ جائے گی اور گکھڑون کے متعلق کل معلومات ایک جگہ جمع ہو جائین گے،

جرمنی مین اسلامی علوم

کے

متعلق کارگذاری کی پنج سالہ (۱۹۴۵ء تا ۱۹۵۰ء) روداد

مترجمہ

جناب محمد معز الدین صاحب علوی بی کام

جرمن مستشرق ڈاکٹر اشپیز پروفیسر عربی بون یونیورسٹی آج سے پندرہ سولہ سال پیشتر تین سال تک مسلم یونیورسٹی علی گڈھ مین عربی کے پروفیسر رہ چکے ہین، انھون نے مئی ۱۹۵۱ء کے رسالہ اسلامک لٹریچر لاہور مین مذکورہ بالا عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے، یہ مضمون بہت مفید خصوصاً ان لوگون کے لئے جو اسلامی علوم سے دلچسپی رکھتے ہین، بہت دلچسپ ہے، اور اہلِ مشرق کے لئے اسکی تفصیلات سبق آموز ہین، کیونکہ وہ اپنے قابلِ فخر کارنامون سے نہ محض یہ کہ دلچسپی نہین رکھتے، بلکہ اُن سے بے خبر بھی ہین، شاید اہلِ جرمنی کی یہ کارگذاری ہمارے ملک کے لوگون کے لئے باعثِ شوق ہو، اس لئے عم محترم مولانا سید محمد بدر الدین صاحب علوی نے مجھے اس مضمون کے ترجمہ کا حکم دیا، ان کے ارشاد کی تعمیل مین ناظرینِ معارف کے لئے اس کا ترجمہ اردو مین پیش کیا جاتا ہے۔ (محمد معز الدین علوی بی کام)

دوسری جنگ عظیم اور اُس کے بعد کی اقتصادی مشکلات نے جرمنی مین تحقیقی کام کو بہت کچھ روک دیا تھا، تاہم اس ناسازگار زمانے مین بھی علماء نے اپنے پرانے تحقیقی کامون کو جاری رکھا، اور مستشرقین کی ایک نئی پود بھی وجود مین آئی، گو مالی مشکلات کی وجہ سے طباعت کا کام کم ہو گیا تھا، اور بہت سے ناشر مشرقی

موضوعات کی کتابون کا کام صرف اس وجہ سے نہین کرتے تھے کہ اس کے جاننے والے کم ہین، چنانچہ بہت سے مسودات جو طویل اور گہری تحقیقات کا نتیجہ تھے، نہین چھپ سکے، ان دشواریون کے باوجود بہت سی کتابین اس تحقیقی کام کی شہادت دیتی ہین، جو اس دور مین سرانجام پایا،

ہم اس مقالے کی ابتدا رسالہ جات کے بیان سے کرتے ہین، مشرق کے متعلق بہت سے رسالے جرمنی مین شائع ہو رہے ہین، چنانچہ مجلہ جرمن اورنٹیل سوسائٹی پھر سے جاری ہو گیا ہے، اور اس کی ۱۹۴۹ء، ۱۹۵۰ء کی ایک جلد چھاپی گئی ہے، اور سوسائٹی کے صد سالہ جشن کے موقع پر چار سو صفحات کی ایک جلد حال مین شائع ہوئی ہے، جس مین بہت سے اہم مقالے شامل ہین، جن کی تفصیل دشوار ہے، اسلامی موضوعات سے دلچسپی رکھنے والے اس خبر سے خوش ہون گے کہ رسالہ "ڈر اسلام" جو پروفیسر بکر نے جاری کیا تھا، اب پروفیسر اسپولر ہمبرگ یونیورسٹی کی ادارت مین شائع ہو رہا ہے، اس کے تازہ ترین نمبرون مین اسلام سے متعلق تاریخی اور تہذیبی معیاری مضامین شائع ہوئے ہین، دو نئے رسالے اور جاری ہوئے ہین، ایک "دنیائے مشرق" جس مین اسلامی موضوعات کے علاوہ زبان، ادب اور قدیم اشوریون کے متعلقہ امور پر بھی مضامین شائع ہوتے ہین، دوسرا رسالہ "فنونِ مشرق" ہے، اس کے اڈیٹر برلن یونیورسٹی کے پروفیسر کونیل ہین، یہ رسالہ اسلامی فنونِ لطیفہ اور فنِ تعمیر پر خاص طور سے مضامین شائع کرتا ہے، ایشیا کے فنونِ لطیفہ پر بھی اس مین مضامین نکلتے ہین، آسٹریا مین وی آنا کا مجلہ تحقیقات متعلقہ مشرق پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے،

اب ہم ان مقالون کا ذکر کرتے ہین، جو اسلامی علوم سے متعلق ہین، اور اس سلسلہ کو عربی سے شروع کرتے ہین، پروفیسر پاریٹ جو ٹیوبنگن یونیورسٹی مین پروفیسر لٹمان کے جانشین ہین، قرآن شریف کے نئے ترجمے مین مشغول ہین، جن نئے اصولون اور طریقون پر وہ ترجمہ کر رہے ہین، اسکی تشریح کے لئے انھون نے ایک مستقل کتاب "قرآنی تحقیقات کی تجدید" کے نام سے لکھی ہے، اسمٰعیلیون کی تفسیر "مزاج التسنیم" مصنفہ ضیاء الدین اسمٰعیل ھبۃ اللہ کے تین حصون کو پروفیسر اسٹراتمن (ہمبرگ یونیورسٹی) نے شائع کیا ہے، پروفیسر فوک

ہالے یونیورسٹی نے جو پیشتر ڈھاکہ یونیورسٹی مین عربی کے پروفیسر رہ چکے ہین، حال مین ایک اصولی اور قابل فخر کتاب عرب کے نام سے شائع کی ہے، جس مین عربی ادب کے وسیع مطالعے کی بنیاد پر قدیم عربی کی ترقی کو بہت ستھرے انداز مین دکھایا ہے، برلسٹن یونیورسٹی کے علما نے ۱۹۲۰۵ء مین جو وفد شام بھیجے تھے، ان کے جمع کئے ہوئے مواد سے پروفیسر لٹمان نے ایک کتاب عربی کتبہ جات کے نام سے شائع کی ہے۔

اس دور مین تاریخ اسلام پر بھی کافی کام ہوا ہے، سامرا کے متعلق پروفیسر ہارزفیلڈ نے ایک نئی کتاب "شہر سامرا کی تاریخ" کے نام سے شائع کی ہے، جس مین انھون نے صوبون اور شہرون کے محل وقوع کو بیان کرتے ہوئے اُن کے باشندون اور خلفاء کی تاریخی تصویر پیش کی ہے، مشہور عالم پروفیسر ہارٹمن برلن یونیورسٹی نے ایک کتاب شائع کی ہے، جس مین اسلام، اس کے آغاز، بنیادی عقائد، اور ترقی پر نظر غائر ڈالی ہے، اور قاہرہ کے قدیم فاطمی خلفاء کی تاریخی تحقیق بھی خوبی سے کی ہے، پروفیسر بارٹیٹ نے روحی دنیا پر اہل عرب کے حملون کی تاریخ تحریر کی ہے، پروفیسر اسپیولر نے عہد مغلیہ پر ایک تاریخی تبصرہ لکھا ہے، انھون نے پروفیسر اسٹراتھمن کے ساتھ مل کر ایک اور کتاب "مذاہب کا مقابلہ" بھی لکھی ہے، جس مین سُنّی اور شیعہ مذہبون کا خاکہ پیش کیا ہے، پروفیسر تاشنر نے اپنی کتاب "اسلامی تاریخ کا مواد" مین سلطان اشرف اینخیل کے رسالہ فتوۃ کا ترجمہ کیا ہے، اس رسالہ کا ذکر قلقشندی کی صبح الاعشیٰ مین موجود ہے، پروفیسر جاشکنے مصطفےٰ کمال کی سفارت اناطولیہ کا جائزہ لیا ہے، جہان سے مصطفےٰ کمال نے اپنی قومی تحریک شروع کی تھی، پروفیسر اشپیلر نے اپنی کتاب جرمن زبان مین "مشرقی مضامین" مین مشرق و مغرب کے باہمی تعلقات کا ایک باب قائم کیا ہے، پروفیسر باریٹ نے اپنے لکچر "اسلام اور یونانی علوم" مین نہایت قابلیت کے ساتھ اسلام پر یونانی علوم کے اثر کو بیان کر کے یہ بتایا ہے کہ اہل عرب نے معتزلہ کے ذریعہ یونانی تعلیم قبول کی، پروفیسر پاتھی نے اپنی کتاب "اسلام اور قومیت" اور پروفیسر بروئرنگ نے اپنی کتاب "دنیائے عرب" مین موجودہ مسائل پر روشنی ڈالی ہے، مؤخر الذکر نے عرب ریاستون اور ان کی تازہ ترین سیاسی

نشو و نما کا ذکر کیا ہے، پروفیسر ہائمن نے "مشرق ادنی کا تیل" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، جس مین تیل کے اقتصادی پہلوؤن پر بحث کی ہے، پروفیسر لٹمان نے ایک بیش بہا مجموعہ عربی متون کا شائع کیا ہے، جس مین اسلامی اور مصری امثال کے نمونے، درج کئے ہین، انھون نے ایک اور کتاب "مصر مین اہل عرب کی جھاڑ پھونک کی رسم" پر شائع کی ہے، جو عورتون مین رائج تھی، اور جس کے بعد گانا ہوتا تھا، عمومی شاعری کے دو متن بھی مع ترجمہ کے شائع کئے ہین، ان مین ایک احمد البدوی کے عنوان سے ایک نظم ہے جو مصر کے مشہور صوفی احمد البدوی سے متعلق ہے، دوسری کا عنوان ہے "محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہر دلعزیزی کے بھیس مین" اس نظم مین دو سو بائیس (۲۲۲) اشعار ہین، اس کا موضوع عنوان سے ظاہر ہے، جرمن زبان مین ترجمون کے ذریعہ موجودہ عربی ادب عوام تک پہنچ گیا، ہے، محمود تیمور کی کتاب مختصر کہانیان کا ترجمہ پروفیسر اشپیلر نے کیا ہے، ڈاکٹر ہائینریخ نے اپنی کتاب "صدائے عوام" مین بھی محمود تیمور کی اسی کتاب کا ترجمہ کیا ہے، عربون کے اقوال اور اشعار کے مجموعے ہانسین اور طاہر خمیری نے مرتب کئے ہین، پروفیسر لٹمان نے بدوی کہانیون مین سے دو کہانیون کا انتخاب کیا ہے، جو دنیا کے مشہور ادب مین شامل ہونے کے قابل ہین،

بڑے اہتمام کے بعد جرمنی مین موجودہ عربی زبان کا ایک مسودہ لغت جو ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے ابھی حال مین شائع ہوا ہے، اس کے مرتب پروفیسر وہر نے اخبارون، کتابون، ریڈیو، اور مستند مستشرقین کی مدد سے اس کتاب کا مواد حاصل کیا ہے، ایک اور لغت کی کتاب پروفیسر ہیگل نے تالیف کی ہے جو عربون کے فن کیمیا کے متعلق ہے، یہ کتاب اُن کی علم کیمیا کی تصانیف کے غائر مطالعہ کے بعد لکھی گئی ہے، اسی مصنف نے کیمیا پر عربون کی تصانیف کے ان قلمی نسخون کی دو فہرستین تیار کی ہین، جو برلن اور گوتھا مین ہین، ڈاکٹر گاربرس نے کتاب "کیمیاء العطر والتسعیدات" کا ترجمہ اور شرح لکھ کر عربی عطر سازی، اور علم کیمیا کے متعلق ایک مفید کتاب کا اضافہ کیا ہے، یہ کتاب مشہور فلسفی الکندی کی تصنیف ہے:

جرمن علماء نے ترکی زبان، ادب، اور تاریخ کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے، جہان تک اس کی صرف و نحو

کی تعلیم کا تعلق ہے، مبتدیون اور ان لوگون کے لئے جو ترکی زبان سیکھنا چاہتے ہین ہم پروفیسر ریولی کی کتاب پڑھنے کی سفارش کرتے ہین، پیتیرس نے موجودہ ترکی کی ایک باقاعدہ صرف ونحو لکھی ہے جس مین قواعد سے زیادہ حوالہ جات ہین، پروفیسر گابین ہمبرگ یونیورسٹی نے وسط ایشیا کے اسلام سے پہلے کے ترکی مسودات بہت خوبی کے ساتھ پیش کئے ہین، اور نئے ادب کے کچھ ترجمے کئے ہین، پروفیسر اشپیلر نے ترکی کے ہمعصر اہل قلم کی تاریخ شائع کرنے کے بعد اب دو ناول بھی ترجمہ کر رہے ہین، ایک کا نام "قتل کا تاوان" اور دوسرے کا "روح کا گھر" ہے، موجودہ ترکی کے طرز تحریر کو دکھانے کے لئے ڈاکٹر شمل نے ڈاکٹر کیسلنگ کی مدد سے اس کا نمونہ جرمن زبان مین پیش کیا ہے، اور اس سلسلہ مین ترکون کے مشہور ناول نویس یعقوب قادری کے ناول "نور بابا" کا ترجمہ ڈاکٹر شمل نے کیا ہے، ڈاکٹر کیسلنگ نے ان کی تصنیف "بر سر انجام" کی تخاب کردہ مختصر کہانیون کا جرمن مین ترجمہ کیا ہے،

ترکی تاریخ کے سلسلہ مین پروفیسر دودا نے موجودہ ترکی تاریخ کی ترقی کا حال اپنی کتاب موسومہ "خلافت سے جمہوریت کی طرف" مین بیان کیا ہے، اس مین انھون نے خاص طور سے ترکون کے دماغی رجحانات پر زیادہ توجہ دی ہے، پروفیسر تاشنر نے ترکی کی تاریخ "جہان نما" مصنفہ محمد نشری کا ایک نیا ایڈیشن تیار کیا ہے، جو لیپزگ کے مستشرقین کی سوسائٹی کی جانب سے شائع ہونے والا ہے، پروفیسر دودا نے ایک کتاب مین بلغاریون پر عثمانیون کے غلبہ کے سلسلہ مین اقتصادی اور سماجی مسائل پر روشنی ڈالی ہے،

فارسی علوم مین قدیم اور قرون وسطیٰ کو چھوڑ کر ہم صرف اسلامی دور کے مطبوعات کو بیان کرتے ہین، حیات شیخ اسحاق الکازرونی مصنفہ محمود بن عثمان کی ڈاکٹر فرٹز مائر نے تصحیح کی ہے، ڈاکٹر شمل نے مثنوی مولانا روم کے استعارون کو ترتیب دیا ہے، ڈاکٹر ہران کے مقالے "احوال شاہ اسمٰعیل" نے دولت صفویہ کے پہلے بادشاہ کی زندگی پر روشنی ڈالنے کے لئے نیا مواد فراہم کر دیا، فرٹز اشپیلر نے ایک کتاب "ایران مین دول مغول" لکھی ہے، جس مین ایرانی، روسی، امریکی اور یورپین ذرائع سے ایران کی سیاسی حالت کا مکمل نقشہ

دکھایا ہے،

پروفیسر آرڈمن کی کتاب "ساسانیون کے فنون" اس موضوع پر ایک بیش قیمت اضافہ ہے،

پروفیسر ہنز کے مقالات جو مختلف رسالون مین شائع ہوئے ہین، بہت اہم ہین، اُن کی تحقیقات نے قرون وسطیٰ کے اسلامی اقتصادیات کے متعلق بڑے بنیادی نتائج نکالے ہین، انھون نے اپنے ایک مقالہ "قرون وسطیٰ مین مشرق وسطیٰ و مشرق ادنیٰ کے درمیان معاشرتی تعلقات" مین ایک نیا و عجیب موضوع پیش کیا ہے، اور مندرجہ ذیل تحقیقاتون کے ذریعہ اس موضوع کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کی کوشش ہو رہی ہے،

۱- قرون وسطیٰ مین اسلامی ممالک کے سرکاری خزانون کا حساب وکتاب (Darislam vol. 29)

۲- تیرھوین و سولھوین صدی مین مشرقی اناطولیہ کا قاعدۂ لگان (مجلہ جرمن اورنٹیل سوسائٹی جلد نمبر ۱۰۰)

۳- قرون وسطیٰ مین مشرق قریب کے قواعد لگان (Bulletin vol. 13, No. 52)

پروفیسر اوزن حسن (Uzum Hasan) جو عثمانیون کے مقابلہ مین یورپ کی طاقتون کا پندرھوین صدی مین دوست تھا، اسکی تاریخ "ایران مین قومی حکومت" کا ترجمہ بھی پروفیسر ہنز نے جرمن زبان مین کیا ہے، جو ۱۹۳۶ء مین برلن سے شائع ہوا ہے، یہ کتاب نہایت اہم ہے،

ہم نے اس مضمون مین سامی زبانون، ادبیات، قدیم مشرق اور ہندوستان کے علوم و فنون پر جو تحقیقات اس دوران مین ہوئی ہے، ان کو نہین لکھا، اس پر بھی کافی کام ہوا ہے، جو لوگ جرمن اور آسٹرین زبان کی مشرقی علوم کی کتابون کے مطالعہ سے دلچسپی رکھتے ہین، ان کو (The oriental in Germany and austria 1945 Literature an-) کا مطالعہ کرنا چاہئے، یہ رسالہ ابھی حال ہی مین شائع ہوا ہے،

—— · ❖ · ——

مکتوب جرمنی

"الحمد للہ کہ دار المصنفین کی آواز ہندوستان کے باہر برابر قائم ہے، اور اسلامی و مشرقی علوم کے علما و محققین ان مسائل کے متعلق وقتاً فوقتاً اس کی جانب رجوع کرتے رہتے ہیں، چنانچہ گذشتہ دسمبر میں ایک جرمن اسکالر نے ہندوستان کی زبانوں کے متعلق بعض سوالات پوچھے ہیں ان کو ناظرین معارف کی دلچسپی کے لئے شائع کیا جاتا ہے"۔

Gohann Karl Teufel ۲۶ نومبر، المانیہ

Muhlenrain 30a

Weil am Rhein.

الی آقای شاہ معین الدین احمد ندوی دار المصنفین اعظم گڈھ یوپی، ہندوستان،

آقاے محترم:-

آدرس شمارا از طرف دکترم، حمید اللہ کہ حالا در پایہ تخت فرانسہ منزل می کند، دریافت کردم، علت اینکہ بجناب عالی زحمت دادہ، و این نامہ را نوشتم اینست کہ از شما سوال می کنم کہ آیا شما میل دارید با فانی بزبان فارسی در بارہ امور دولت جدید ہندوستان مکاتبہ کنید، فعلاً معرفت آن دولت نو درین کشور کمست و محال است کہ در روزنامہ ہا مرتب در مورد آن مملکت اخبار بخوانیم ازین جہت از مکاتبہ با شخص

ہندوستانی خیلے خوش وقت وسپاسگذار خواہم شد، بندہ المانی ہستم و در دانش گاہ بال درس زبانہاے فارسی و عربی و ترکی و ہندی قدیم می کنم آن زبانہا براے اروپاییان خیلے مشکل است خصوصاً زبان عربی حالا مشغول ترجمہ یک کتاب فارسی ہستم یعنی "خلاصۃ المناقب" کہ از قلم شیخ سید علی ہمدانی است و او در ختلان در ولایت بدخشان در عصر ہشتم ہجری زندگانی کرد،

درین دانشگاہ دو دانشجوے ایرانی ہست کہ درس شیمیائی می کنند، گاہ گاہ با ایشان ملاقات و صحبت بزبان فارسی می کنم، یکی از ایشان خانم سویس را زن گرفتہ است،

پیش جنگ بندہ با فلان جوان لاہوری مکاتبہ کردم، اسمش "اندرجیت لال رکھی" بود، و ازان اسم قیاس کردم کہ ہندو بود،

اگر اجازہ بدہید از شما چند سوال در مورد احوال دولت ہندوستان می پرسم، ازان جہت کہ بندہ تحصیل زبانہا می کنم، خصوصاً این مسئلہ جالب توجہ من است کہ کدام زبانہا در آن دولت نو استعمال می شود، آیا زبان انگلیزی ہمیشگی در ادارات حکومت وپست و در دانش گاہ و مدارس اولی استعمال می گردد؟ آیا زبان ہندوستانی دائماً بحروف ناگری نوشتہ می شود و یا بحروف عربی و یا اردو؟ آیا در دانشگاہ ہا زبانہاے اروپی غیر زبان انگلیزی تدریس می شود؟ از جواب شما منتظر ہستم،

با تقدیم احترامات

یوہان کارل تویفل

تاریخ فقہ اسلامی

مصری عالم خضری کی تاریخ التشریع الاسلامی کا ترجمہ جس میں ہر دور کی فقہ اور فقہا پر مکمل اور ایسا تبصرہ ہے، جس سے جدید فقہ کی ترتیب میں مدد مل سکتی ہے، قیمت ہے

"منیجر"

بابُ التقریظ والانتقاد

تاریخ مُسلمانانِ پاکستان و بھارت

(جلد اوّل)

از

سید صباح الدین عبد الرحمن ایم ، اے ،

مذکورۂ بالا کتاب اردو زبان کے مشہور و معروف اہلِ قلم جناب سید ہاشمی صاحب فریدآبادی کی تصنیف ہے جس کو انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی نے شائع کیا ہے، یہ تاریخ غالبًا کالج کے طلبہ کے لئے لکھی گئی ہے، یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان میں بیٹھ کر جو اہلِ قلم بھارت و پاکستان کی تاریخ مرتب کرے گا، اس کی نوعیت بھارت میں بیٹھ کر لکھنے والے کی تاریخ سے بالکل علٰحدہ ہو گی، اسی طرح بھارت کے رہنے والے اہلِ قلم اہلِ پاکستان کی لکھی ہوئی تاریخوں پر تنقید و تبصرہ کرتے وقت کچھ خاص خاص ذمہ داریاں محسوس کرتے ہیں، لیکن ہم کو اپنی اس خوشی کے اظہار کرنے میں تامل نہیں کہ زیرِ نظر کتاب میں کوئی ایسی متنازعہ فیہ بات نہیں جس سے کوئی تلخ یا ناخوشگوار بحث پیدا ہوتی ہو، دراصل یہ کتاب سید ہاشمی صاحب فریدآبادی کی اُس تاریخ کا ترقی یافتہ اڈیشن ہے، جو انھوں نے تیس برس پہلے حیدرآباد کے قیام کے زمانے میں جامعہ عثمانیہ کے انٹرمیڈیٹ کے طلبہ کے لئے لکھی تھی، اسی لئے اس میں بدلے ہوئے حالات و جذبات کے اثرات نہیں پائے جاتے، لیکن انھوں نے اس زیرِ نظر کتاب کی جو ترتیب دی ہے، اُس میں بہت سے

مفید اور ضروری معلومات کا اضافہ کیا ہے، جس سے یہ کتاب دلچسپ اور قابلِ قدر ہو گئی ہے،

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اب تک نصاب کے لئے جتنی کتابیں لکھی گئیں، وہ انگریزوں ہی کے بتائے ہوئے طریقوں پر ترتیب دی گئی ہیں، انگریزوں نے اپنے سیاسی مصالح کی خاطر ایسی تاریخیں لکھیں، جن سے ہندوستان کی رہنے والی قوموں میں خواہ مخواہ باہمی نفرت و کدورت پیدا ہوتی رہی، ہندوستان کے اسلامی عہد پر ریسرچ کرنے اور کتاب لکھنے والوں کا سب سے بڑا ماخذ ہنری الیٹ کی انگریزی تاریخیں رہی ہیں، معارف کے ان صفحات میں پہلے بھی یہ کہا جا چکا ہے کہ حکومتِ برطانیہ کے اس ایجنٹ نے اپنی آٹھوں جلدوں میں فارسی تاریخوں کے ترجمے اور اقتباسات کی ترتیب اس طرح دی ہے کہ ہندی مسلمانوں کی تاریخ صرف جنگ و جدل، قتل و خونریزی اور ظلم و ستم کی داستان معلوم ہوتی ہے، الیٹ نے ہندوستان کے اسلامی عہد کے روشن پہلوؤں کو قصدًا نظرانداز کر کے اس لئے صرف تاریک پہلو پیش کئے کہ ہندوستان کے باشندے انگریزوں کی حکومت کو سایۂ رحمت سمجھ کر ان کی اطاعت مندانہ اخلاص کا خراج ہمیشہ پیش کرتے رہیں، چنانچہ اس کا یہ مقصد اس کی کتاب کی پہلی جلد کے دیباچہ سے بھی واضح ہو جاتا ہے، ہندوستانیوں نے بھی نصاب کی کتابیں لکھیں لیکن اُن میں زیادہ تر ایسے تھے، جو فارسی زبان نہیں جانتے تھے، اس لئے انھوں نے الیٹ کی تاریخوں ہی کو اپنا ماخذ بنا لیا اور وہ اسلامی عہد کے ان تمدنی، ثقافتی، علمی اور عمرانی کارناموں کو بالکل بھولتے گئے، جن کا ذکر فارسی ماخذوں میں تو تھا لیکن الیٹ ان کو اپنی مختلف جلدوں میں مصلحۃً حذف کرتا گیا ہے، ظاہر ہے کہ ایک خون آلود اور خون آشام تاریخ پڑھنے کے بعد طلبہ کے ذہن و دماغ پر وہی اثرات مرتب ہوتے رہے، جو انگریز چاہتے تھے، اور اب بھی جب کہ انگریز جا چکے ہیں، یہ زہریلے ذہنی اثرات مدتوں کی کوشش اور خاص نہج کی لکھی ہوئی کتابوں ہی کے ذریعہ سے دور ہو سکیں گے،

ہم سید ہاشمی صاحب کی زیرِ نظر کتاب کا خیر مقدم اس لئے کرتے ہیں کہ یہ عام نصاب کی

کی تاریخون سے کچھ جداگانہ حیثیت رکھتی ہے، کتاب محمد بن قاسم سے اورنگ زیب عالمگیر تک کے حالات پر مشتمل ہے، لیکن اس مین مسلمانون کی فتح و تسخیر کے علاوہ علحدہ علحدہ ابواب مین ہر دور کے انتظامی، تمدنی، اقتصادی، صنعتی، مذہبی، معاشرتی اور علمی کارنامون کو بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، جو عام نصاب کی کتابون مین کم پائے جاتے ہین،

مسلمانون نے ہندوستان مین آکر کیا کیا سیاسی انقلابات پیدا کئے، ان کے تمدن سے یہان کی معاشرت مین کیا کیا تغیرات پیدا ہوئے، انھون نے ہندوستان کی اقتصادی اور معاشی حالت کو بہتر بنانے مین کیا کیا تدبیرین اختیار کین، اُن کی وجہ سے تجارت و صنعت مین ہندوستان کتنا آگے بڑھ گیا، علما، و مشائخ نے مذہب و معاشرت کو کس طرح سنوارا، اور پھر ان کی مذہبی تحریکات۔۔۔۔ سے یہان کے باشندے اپنے مذہبی خیالات مین کس حد تک متاثر ہوئے، انکے علوم و فنون کے سرچشمون سے یہان کی سرزمین کس قدر سیراب ہوتی رہی، یہ تمام عنوانات ایسے ہین، جن پر علحدہ علحدہ مستقل کتابین لکھی جا سکتی ہین، ظاہر ہے کہ جناب سید ہاشمی صاحب اپنی ایک عام اور مجمل تاریخ مین ان عنوانات پر بہت زیادہ پھیلا کر لکھنے سے معذور تھے، پھر بھی یہ تمام باتین ایسی ہین جن سے طلبہ کو روشناس کرنا ضروری ہے، اور فاضل مؤلف مُبارکباد کے مستحق ہین کہ انھون نے اختصار کے ساتھ ان تمام باتون کو خوبی سے پیش کیا ہے، اور اُن کو قلمبند کرتے وقت کچھ ایسا دلنشین انداز بیان اور شگفتہ طرزِ تحریر اختیار کیا ہے کہ عام پڑھنے والون کو بھی یہ کتاب شروع سے آخر تک دلچسپ نظر آئے گی، کتاب کے باب دوم مین "عربی حکومت سندھ مین" باب ششم مین "ابتدائی نظامِ حکومت اور تمدن" باب ہفتم مین "اسلامی علوم اور ادبیات" باب چہاردہم مین "مذہبی خیالات اور نئے تاثرات" باب پانزدہم مین "مشاہیر علم و ادب" اور باب بست و یکم مین گیارہوین صدی ہجری پر ایک نظر کے عنوانات سے جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ نہ صرف طلبہ کے لئے مفید اور دلچسپ ہے، بلکہ ان سے نصاب کی تاریخ لکھنے والون کے لئے نئی شاہراہین بھی کھلتی ہین کہ اب

جب کہ بادشاہون کی حربی و عسکری کارگذاریون سے زیادہ قومون کے مذہب و اخلاق، تمدن و معاشرت، علوم و فنون، تجارت و صنعت وغیرہ کے تدریجی ارتقاء و فروغ سے دلچسپی لی جا رہی ہے، تو انہی پہلوؤن کو زیادہ واضح کرنے کی ضرورت ہے، یہ اس لئے بھی کہ طلبہ کا ذہن اپنے ماضی کی تاریخ پڑھ کر کچھ ایسا تیار ہو جائے کہ وہ اپنی تعلیم ختم کر کے اپنے ملک کے اسی قسم کے تعمیری کامون کی طرف خواہ مخواہ متوجہ ہو جائین،

اس مین شک نہین کہ ازمنۂ وسطیٰ کی گذشتہ تاریخین جنگ و جدال کے واقعات سے کچھ ایسی لبریز ہین کہ آج کا اہلِ قلم اُن کی تفصیلات لکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ تاریخین عہد سپہگری مین لکھی گئی ہین، جب کہ ہر فرد اپنا جوہر میدانِ جنگ مین دکھانا فخر سمجھتا تھا، اور جو اہلِ قلم اہلِ سیف بننے سے معذور رہے، وہ اپنی سپہگری کے دبے ہوئے جذبات کاغذ کے صفحات پر منتقل کرتے رہے، وہ مختلف معرکہ آرائیون کا مرقع اپنی کتابون مین کچھ اس لئے بھی پیش کرتے تھے کہ پڑھنے والون مین بھی سپہگری کا ولولہ پیدا ہوتا رہے، لیکن اب ذہنی تربیت کی نوعیت ہی بدل چکی ہے، اس لئے تاریخ نویسی کے طرز کو بھی بدلنے کی ضرورت ہے، مثلاً ہندوستان کے سلاطین مین محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، قطب الدین ایبک، بلبن، علاء الدین خلجی، غیاث الدین تغلق، فیروز شاہ اور تقریباً تمام شاہانِ مغلیہ نے کشور کشائی مین بڑی شہرت پیدا کی، اسی طرح ان بادشاہون کے فوجی جنرل بختیار خلجی، نصرت خان، ظفر خان، ملک کافور اور عہدِ مغلیہ مین، بیرم خان، منعم خان، مرزا عزیز کوکہ، اعتماد الدولہ آصف خان، مہابت خان، میر جملہ اور شایستہ خان وغیرہ نے مختلف علاقون کی تسخیر مین بڑی ناموری حاصل کی، لیکن آجکل ملک گیری اور سامراجیت دونون ایک ہی چیز سمجھی جاتی ہین، اس لئے موجودہ مذاق پر فتوحات کی تفصیلات گران گذرتی ہین، مگر مذکورۂ بالا فاتح اپنے زمانے کے کچھ ایسے سپہ سالار اور سپاہی بھی تھے جن پر ہر قوم کو ناز ہو سکتا ہے، اب ان کی ملک گیری کی تفصیل لکھنے کے بجائے، اُن کی شجاعت، بہادری،

جانبازی کے قصے، اور اُن کی سپہ سالاری اور سپہ گری کے آرٹ مرتب طریقہ پر پیش کئے جائین، تو یہی سامراجی قوت کے علمبردار تاریخ کے پردے پر کچھ اور ہی حیثیت سے جلوہ گر ہو جائین گے، اگر یہی یورپ کی کسی قوم کے افراد ہوتے تو نہ جانے وہان کے اہل قلم انکے اوصاف کو کن کن طریقون سے پیش کر کے ان کو بڑا قومی ہیرو بنا دیتے، دور کیون جائیے، کرنل ٹاڈ نے راجپوتون کی شجاعت و بہروازمائی کے قصے کچھ ایسے دلآویز پیرایہ مین پیش کئے ہین کہ اُن کو پڑھ کر بہادری اور معرکہ آرائی کی ایک نئی روح پیدا ہو جاتی ہے، زیر نظر کتاب کے فاضل مؤلف نے کرنل ٹاڈ کو راجپوتون کا فرنگی بھاٹ کہا ہے، وہ بھاٹ ہی سہی لیکن اس کی مداحی اور بھٹئی نے راجپوتون کی سپہگری کو زندہ کرنے مین جو مفید خدمات انجام دی ہین اس سے کون انکار کر سکتا ہے، غزنویون، غلامون، خلجیون، تغلقون، اور مغلون کی تاریخین بھی اُن کی عدیم المثال شجاعت اور غیر معمولی بہادری کے واقعات سے بھری پڑی ہین، لیکن آج تک کسی اہل قلم نے اُن کو ولولہ انگیز طریقہ سے پیش کرنے کی تکلیف ہی نہین اٹھائی، اس لئے اُن کے جوہر کمال پر بھی پردہ پڑا ہے، میدان رزم سے ہٹ کر بزم سیاست مین بھی بہت سے سلاطین، وزراء، اور امراء ایسے گذرے ہین جن کی سیاست، فراست، اور دور اندیشی کا تجزیہ کیا جائے، تو پولٹیکل سائنس کا ایک قابل قدر لٹریچر جمع ہو جائے، لیکن کسی نے اُن کو بھی قلمبند کرنے کی زحمت گوارا نہین کی، نتیجہ یہ ہے کہ ہماری نظر سے وہ تمام پہلو اوجھل ہین، جن کی وجہ سے ماضی کی تاریخ شاندار کہی جا سکتی ہے، اور ہم یہ سمجھنے لگے ہین کہ ہماری تاریخ ویسی شاندار نہین جیسی کہ ہونی چاہئے، حالانکہ یہ صحیح نہین، بلکہ ہم کو ہمارا ماضی ایسا شاندار نظر نہین آتا، جیسا کہ یہ واقعی تھا، اور یہ قصور ہمارے مورخون کا ہے، جنھون نے اپنے ذوق، اور ماحول کے مطابق اس عہد کی صرف ایسی ہی باتین قلمبند کین، جو آج پسند نہین کی جاتین، اور ہماری تاریخ انتشار، واختلال ہی کی ایک لامتناہی داستان معلوم ہوتی ہے،

از منۂ وسطیٰ کا یہ انتشار اور اختلال، اور اُن سے پیدا ہونے والی ساری خرابیان انگریزون کی

تاریخ مین بھی موجود ہین، لیکن انگریز مورخون نے اپنی تاریخ لکھتے وقت ان خرابیون کو اس طرح نظرانداز کیا ہے کہ ان کا ماضی اتنا شاندار معلوم ہونے لگا ہے، جتنا کہ وہ واقعی نہ تھا، لیکن ہمارے مورخ، ہمارے ماضی کو اتنے شاندار طریقہ پر پیش نہ کر سکے، جیسا کہ یہ سچ مچ تھا، ان فروگذاشتون کی تلافی نئے اہل قلم ہی کر سکتے ہین، ظاہر ہے کہ اس تلافی کے لئے غیر معمولی تلاش تحقیق، اور امعان نظر کی ضرورت ہے، اور جب ایسی قابل قدر محققانہ کتابین شائع ہو چکین گی، تو ان کا نچوڑ طلبہ کی درسی کتابون مین بھی شامل ہو سکے گا، تاکہ صحیح معنون مین ان کی ذہنی تربیت ہو سکے،

محترم سید ہاشمی صاحب نے جس محنت و کاوش کے ساتھ اس کتاب کو ترتیب دیا ہے، وہ ایک حد تک گذشتہ فروگذاشتون کی تلافی ہے، لیکن وہ ایک کہنہ مشق اہل قلم اور وسیع النظر مورخ ہین، اس لئے اگر ہم یہ کہین کہ ان کی اس کتاب مین اور بھی زیادہ خوبیان ہونی چاہئے تھین، تو شاید بے جا نہ ہو گا، ہم ان کا پورا احترام کرتے ہوئے ان کی توجہ بعض باتون کی طرف مبذول کراتے ہین،

انھون نے اپنی کتاب مین انگریزی ماخذون کا حوالہ ضرور دیا ہے، لیکن یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ انھون نے جا بجا ال فنس ٹن، آکس فورڈ ہسٹری، گبن کی تاریخ ہند، لین پول، راورٹی، ایڈورڈ ٹامس، الیٹ، مورلینڈ، بلوخ من وغیرہ کا بھی حوالہ دے کر اپنی کتاب کو داغدار کیا ہے، ان انگریز مورخون نے مسلمانون کے عہد کی تاریخ کو کچھ ایسا نقصان پہنچایا ہے کہ ان کو بالکل ہی نظرانداز کر دینا بہتر تھا، خواہ ان کی کچھ رائین ہمارے لئے کتنی ہی موافق اور خاطر خواہ کیون نہ ہون، فاضل مؤلف خود ہی رقمطراز ہین کہ انگریز تاریخ نویس عموماً جہل وحسد سے یا فتنہ پردازی اور تفرقہ اندازی کے لئے واقعات (ص ۳۱۲) کو مدت سے مسخ کرتے، اور مسلمانون کے دور حکومت کو برے سے برے رنگ مین دکھاتے رہے ہین، لیکن اس رائے کے باوجود یہ کہنا شاید نا مناسب ہو گا کہ فاضل مؤلف انگریز مورخون سے کچھ متاثر

بھی ہین اور نہ وہ اپنی کتاب مین ان کو دودھ کی مکھی ہی کی طرح نکال کر پھینک دیتے، اور پھر محمد بن قاسم کی فتوحات کا ذکر یہ لکھ کر نہ شروع کرتے کہ

"لین پول نے محمد بن قاسم بن محمد کی کہانی کو تاریخ کا ایک رومانس بنایا ہے"[1]

(صفحہ ۸۰)

اور اس رومانس کی گویا تائید کرتے ہوئے اس کی نوعیت یہ بتائی ہے کہ ایک دن حجاج نے محمد بن قاسم سے جو رشتے مین اس کا بھائی ہوتا تھا کہا کہ اے ابن عم مین تجھے بڑھانا چاہتا ہون تیری جو خواہش ہو بیان کر، محمد نے کہا مجھ سے اپنی لڑکی بیاہ دے، اس کے بعد حجاج نے دو مرتبہ محمد بن قاسم کے سر پر چھڑی مار کر وہی سوال کیا، لیکن محمد نے ہر مرتبہ وہی جواب دیا، آخر سخت دل حجاج بولا کہ اچھا شرط یہ ہے کہ تو نئے ملک فتح کرے، اور انھین ایسا ضبط مین لائے کہ پھر ہاتھ سے نہ جائین، اس کے بعد کم سن محمد بن قاسم نے اس شرط کو خوبی سے پورا کیا، معلوم نہین فاضل مؤلف نے اس رومانس کا ذکر کرنا کیون پسند فرمایا ہے، حالانکہ انھون نے جامعۂ عثمانیہ کے لئے جو تاریخ ہند لکھی تھی، اس مین اس رنگین داستان کا ذکر نہین تھا، معلوم نہین اب کونسی مصلحت پیدا ہوگئی ہے کہ طلبہ کو اس رومانس کا بتا دینا ضروری سمجھا گیا ہے، خود فاضل مؤلف کا بیان ہے کہ

"حق یہ ہے کہ محمد بن قاسم پاکستان و ہند کے مسلمانون کا پہلا سردار، کاروان سالار ہے، یہ مبارک نام ان کے دلون سے کبھی نہین مٹے گا، اور اس کے کارنامے ملت اسلامی خصوصاً پاکستان کی تاریخ مین قیامت تک یادگار اور احترام و احسان مندی کے سزاوار رہین گے"

انھون نے جامعہ عثمانیہ کے لئے جو تاریخ لکھی تھی، اس کے حصۂ دوم مین انہی جذبات کا اظہار

[1] عام تاریخون مین ہے کہ محمد بن قاسم حجاج کا بھتیجا تھا،

اور بھی مؤثر طریقہ پر کہا تھا، اس مین انھون نے لکھا تھا کہ

"مجموعی طور پر عرب فاتح سندھ کے جنگی کارنامون کے مقابلے مین کسی سپہ سالار کا نام پیش کیا جا سکتا ہے، تو وہ موسیٰ بن نصیر یا طارق فاتح اندلس یا قتیبہ بن مسلم ہین جو اسی زمانہ مین ایک طرف مراکش و اندلس اور دوسری طرف سمرقند و بخارا مین پے در پے فتوحات حاصل کر رہے تھے" (ص ۴۲)

اب سوچنے کی بات ہے کہ کیا پاکستان و ہند کے مسلمانون کے پہلے سردار و کاروان سالار اور ایسے جلیل القدر سپہ سالار کے قابل یادگار و لائق احترام جنگی و ملی کارنامے مذکورۂ بالا رومانس کے ذکر سے ہلکے نہین پڑ جاتے؟

پھر محمد بن قاسم کے مجاہدانہ فتوحات کا خاتمہ حسب ذیل طریقہ پر کیا گیا ہے،

"جب ملتان کا مال غنیمت حجاج کے پاس پہنچا، تو خوشی سے پھولا نہ سمایا، اور پکار اٹھا کہ اب میرا دل ٹھنڈا ہوا، اب میرے سر سے بوجھ اترا، ۶ کروڑ درہم اور داہر کا سر مین نفع مین ملا"

(ص ۸۰)

یہ سوال ہو سکتا ہے کہ کیا وہ کارنامے جن کے بارہ مین کہا گیا ہے کہ ملت اسلامی کی تاریخ مین احسانمندی کے سزاوار رہین گے، ۶ کروڑ درہم، اور ایک انسان کے سر ہی کے لئے تھے؟ ممکن ہے کہ سنگدل حجاج نے ایسا کہا ہو، لیکن نصاب کی ایک تاریخ مین اس کو نہ لکھا جاتا، تو شاید واقعات کی کسی ترتیب مین کوئی خلل نہ پڑتا، اسی طرح دیبل کی فتح کے سلسلہ مین لکھا گیا ہے کہ

"بڑے مندر ہی کی مریان سات سو تھین، جو بتون کی پرستاری سے نکل کر مسلمانون کی کنیزی مین داخل ہوئین" (ص ۴۳)

اس قسم کی باتون کے ذکر کے بجائے اگر محمد بن قاسم کی ہر دلعزیزی، اس کی طبعی شرافت، ذاتی فراست، اصول کی پابندی بے نفسی، بہادری، اہل سندھ کے ساتھ نرمی، فیاضی اور مذہبی رواداری کے واقعات

قلمبند کئے جاتے، تو اس سے اسلام کی سچی عظمت و وقعت طلبہ کے دلوں میں بھی قائم ہوتی، اور یہ خود بخود ثابت ہو جاتا، جیسا کہ فاضل مؤلف نے لکھا ہے کہ

"سندھ میں راج کا بدلنا خدا کی مہربانی تھی، قہر نہ تھا" (ص ۸۵)

محمد بن قاسم کے بعد سندھ میں عراق سے غالباً ۳۰ والی بھیجے گئے، اور یہاں عربوں کی حکومت تقریباً دو سو سال رہی، اور پھر اُن کے بعد دوسرے مسلمان حکمران خاندانوں کا سلسلہ جاری رہا، لیکن عام طور سے محمد بن قاسم کے نام کے علاوہ اور دوسرے والیوں اور حکمرانوں کا ذکر ہی نہیں کیا جاتا، جس سے مسلمانوں کے اس طویل دورِ حکومت کی تاریخ تاریکی میں پڑ گئی ہے، تعجب ہے کہ ہمارے لائق مؤلف نے بھی تین چار صفحوں میں ایک سرسری تبصرہ کر کے اس دور کی تاریخ کو ختم کر دیا ہے، یہ تسلیم ہے کہ اُن کی مختصر کتاب میں تفصیل و وضاحت کی گنجائش نہ تھی، لیکن سندھ اب پاکستان کا ایک اہم حصہ ہے، غالباً اس کے تعلیمی اداروں میں یہ کتاب ضرور پڑھائی جائے گی، اس لئے فاضل مؤلف جیسے اہل قلم سے توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ اختصار کے ساتھ طلبہ کو سندھ کے ان تمام حکمرانوں کے کم از کم نام ہی سے روشناس کرا دیتے جو تقریباً تین سو سال تک اس خطہ میں اسلامی پرچم لہراتے رہے، یہ اس لئے بھی ضروری ہے تاکہ بقول لائق مؤلف مسلمانوں کی تاریخ گم گشتہ نظر نہ آئے؛

فاضل مؤلف نے لکھا ہے کہ ادریسی اپنے جغرافیہ میں اسلامی سندھ کا ایک دلپسند مرقع پیش کرتا ہے، اور اسے پڑھ کر یہ ماننے میں کچھ تامل نہیں رہتا کہ تین صدی کی حکومت میں مسلمانوں نے ان ملکوں کو کچھ سے کچھ بنا دیا تھا، ادریسی کے علاوہ بشاری مقدسی، ابن حوقل، ابن خردازبہ، مسعودی ابن فقیہ وغیرہ کی مدد سے سندھ سے متعلق بہت سی نئی تحقیقات ہو چکی ہیں، جن سے ہمارے فاضل مؤلف عاجز راقم سے زیادہ واقف ہوں گے، شاید انھوں نے اپنی کتاب کے حجم کو کم کرنے کی خاطر ان سب کا ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا، ورنہ ظاہر ہے کہ ان نئی تحقیقات کے مطابق اگر اُس زمانہ کے سندھ

کی زراعتی، تجارتی، صنعتی، تعمیری، اور علمی ترقیوں کے ساتھ حکومت کے نظم و عام کا ذکر کچھ اور تفصیل کے ساتھ ہوتا، تو خود زیرِ نظر کتاب میں بھی اسلامی سندھ کا ایک دل پسند مرقع نظر آتا، آیندہ کے اہلِ قلم اور خصوصاً نصاب ترتیب دینے والوں کو یہ سوچنا ہے کہ گذشتہ تاریخ کو وہ کن کن صورتوں سے دل پسند مرقع بنا سکتے ہیں، پاکستان کے اہلِ قلم کو تو سندھ کی بھولی ہوئی تاریخ کو اور بھی زیادہ دلآویز طریقہ پر پیش کرنا ہے،

باب سوم میں محمود غزنوی کے حالات و واقعات ہیں، جس کے متعلق فاضل مؤلف نے لکھا ہے کہ وہ مسلمان مؤرخ کی نظر میں نہ تھکنے والا غازی اور ملتِ اسلامی کا محبوب سورما ہے، اس میں شک نہیں کہ اس باب میں محمود غزنوی کی ایک اچھی تصویر پیش کی گئی ہے لیکن یہ اتنی اچھی نہیں جتنی کہ ہم کو فاضل مؤلف کے شگفتہ قلم سے امید تھی، الٰہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر ایشوری پرشاد کی کتاب میڈیول انڈیا، ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے، پروفیسر ایشوری پرشاد نے ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں پر اپنی کتاب میں جابجا جو سخت تنقیدیں کی ہیں، وہ مشہور ہو چکی ہیں، محمود غزنوی بھی اُن کے بر ملامت سے محفوظ نہیں رہا ہے، پھر بھی انھوں نے "An Estimate of mahmud" کی ذیلی سرخی کے تحت محمود کی جو قلمی تصویر کھینچی ہے، وہ یقیناً ہمارے محترم مؤلف کی پیش کردہ تصویر سے بہتر ہے، حالانکہ محمود کی کردار نگاری میں فطری طور سے اُن کے قلم کو زیادہ رواں اور جولاں ہونا چاہیئے تھا، محمود غزنوی کی تاریخی شخصیت ایسی ہے کہ اس کا ہندو مسلمان کے تعصب سے بلند ہو کر مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے، وہ ایک ایسا جنرل تھا جو پنجاب سے لے کر بحیرۂ خزر تک اور سمرقند سے لے کر رے تک اپنے نام کا ڈنکا بجاتا رہا، اس کی شاندار فتوحات سے اس کے سارے معاصرین حیران و ششدر رہے، اُس نے ۳۳ برس کی پیہم لڑائیوں میں ایک دفعہ بھی شکست نہ کھائی، ایک بے مثال سپاہی ہونے کے علاوہ وہ بہت ہی محبوب اور رحمدل انسان بھی تھا، ایک مہربان اور انصاف پسند حکمران کے علاوہ ایک جابر قسم کا حاکم بھی تھا جس کے دور دراز علاقوں میں کوئی قزاقی اور غارت گری کی ہمت نہیں کر سکتا تھا، وہ علوم و فنون کا بہت بڑا مربی

بھی تھا، درویشوں اور بزرگوں کا ادنیٰ خدمت گذار بھی، وہ بے شک دنیا کے بہترین سپہ سالاروں اور حکمرانوں میں سے تھا، خود ہمارے فاضل مؤلف رقمطراز ہیں کہ

"اس کی شجاعت و عدالت، سعادت و سخاوت کے اتنے قصے محفوظ ہیں کہ جمع کئے جائیں تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے"

زیر نظر کتاب میں اگر دو دو چار چار قصے ہی لکھ دیئے جاتے، تو کیا مضائقہ تھا، یہ کیا ضرور ہے کہ ہماری تاریخ کے صفحات جارحانہ جنگ و جدال ہی کے واقعات سے پر کئے جائیں، اگر معتبر اور مستند قصوں اور حکایتوں سے ہماری تاریخ یا تاریخی شخصیتوں کی عظمت و جلالت بڑھتی ہو تو ہم ان کو بلا تکلف تاریخ کے صفحات میں ضرور جگہ دیں، لائق مؤلف نے اپنی تاریخ کے گذشتہ اڈیشن میں "شاہان غزنوی کی علم نوازی" کے عنوان سے جو کچھ لکھا تھا، اس کو ..... موجودہ اڈیشن میں شامل کرنا پسند نہیں کیا ہے، اور محمود کی معارف نوازی کا ذکر چند سطروں میں لکھ کر ختم کر دیا ہے، حالانکہ اس سلطان کی علم پروری اس عہد کا بڑا ہی شاندار کارنامہ ہے،

ہمارے فاضل مؤلف نے اپنی کتاب کے پہلے اڈیشن میں سلطان محمود کے ہندوستان پر حملوں کا ذکر یہ کہکر نظر انداز کر دیا تھا کہ اس کے مجمل حالات اس زمانہ کی عام انگریزی اردو تاریخوں میں موجود ہیں، پھر اسی کے ساتھ یہ لکھا تھا کہ زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہم ترتیب زمانی کے ساتھ یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ غوریوں کے آنے تک ہندوستان کے شاہانِ غزنی کے کیا تعلقات رہے، تاکہ مسلمان بادشاہوں کی تاریخ کا سلسلہ جو اکثر انگریزی تاریخوں میں جا بجا گسستہ نظر آتا ہے، حتی الامکان ٹوٹنے نہ پائے، اسی کے بعد محمود کے جانشینوں کا ذکر شروع ہو گیا ہے، لیکن اس نئے اڈیشن میں فاضل مؤلف نے محمود غزنوی کے حملوں کی تفصیل لکھنا ضروری سمجھا ہے، اور محمود کے جانشینوں کے حالات کو شاید غیر ضروری سمجھ کر چھوڑ دیا ہے، اور ایک ضمیمہ میں سلاطین غزنویہ کے صرف نام اور ان کے دورِ حکومت کے سنین

لکھ دینے پر اکتفا کیا ہے، لیکن ہم کو فاضل مؤلف کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ محمود غزنوی کے جانشینوں کا ذکر ضروری تھا تاکہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی تاریخ گسستہ نظر نہ آئے، ڈاکٹر ناظم نے اپنی انگریزی کتاب "سلطان محمود آف غزنہ" میں بڑی دیدہ ریزی اور کاوش سے محمود کے پیہم حملوں کی ترتیب وار تفصیل لکھی ہے، ظاہر ہے کہ فاضل مؤلف کی نظر اس ترتیب پر ضرور پڑی ہوگی، لیکن معلوم نہیں کیوں اس ترتیب کے مطابق اپنی کتاب میں ان حملوں کا ذکر کرنا پسند نہیں فرمایا، اسی طرح اور دوسرے فرمانرواؤں اور فاتحوں کی فتوحات کی تفصیل لکھنے میں بھی ہمارے محترم مؤلف نے کچھ بخل سے کام لیا ہے، تفصیل سے مراد ہرگز یہ نہیں کہ ہر مسلمان حکمران کے دور میں جو چھوٹی بڑی لڑائیاں ہوتی رہیں، ان کا ذکر کیا جاتا، لیکن ان علاقوں کا کم از کم نام تو بتانا ضروری تھا، جو وقتاً فوقتاً مسلمانوں کے زیر نگین آتے رہے، ادھوری نامکمل اور سرسری معلومات فراہم کرنے سے طلبہ کے معلومات کے ہمیشہ کے لئے سطحی رہ جانے کا اندیشہ رہتا ہے، اختصار کے ساتھ جامعیت ایک آرٹ ہے، جس پر قدرت رکھنا نصاب کی کتاب لکھنے والوں کے لئے لازمی ہے، اب تک نصاب کی تاریخیں لکھتے وقت دقتِ نظر سے کام نہیں لیا جاتا تھا، اسی لئے ہمارے طلبہ کی تاریخی معلومات میں وہ ژرف نگاہی نہیں پیدا ہوتی تھی، جو ان کے لئے ضروری ہے، تاکہ وہ قومی و ملی مسائل کو گہرائی اور دقتِ نظر سے حل کر سکیں،

سلاطین اور بادشاہوں کی کردار نگاری میں بھی ہمارے فاضل مؤلف نے بخل اور عجلت دونوں سے کام لیا ہے، اس کتاب کو پڑھنے کے بعد یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اس میں محمد بن قاسم سے لے کر عالمگیر تک جتنے حکمرانوں کی تصویریں پیش کی گئی ہیں، کیا ان میں سے کسی ایک کی بھی زندگی و سیرت یا اخلاق و کردار یا اس کے مختلف کارنامے ایسے ہیں، جس کو طلبہ اپنے مذہبی، قومی اور ملی جذبات کی بنا پر اپنا ہیرو بنا سکتے ہیں، یا تو ہم یہ تسلیم کر لیں کہ اس ایک ہزار سال کی مدت میں کوئی ایسا حکمران پیدا ہی نہیں ہوا، جس کے اوصاف کی تفصیل بیان کر کے ہم طلبہ کے مذہبی، قومی، اور ملی اخلاق

سیرت کی تعمیر کر سکیں، یا پھر ہم کو یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ ہمارے گذشتہ عہد کے مورخوں کی غفلت اور قلمی کوتاہی کی وجہ سے ان حکمرانوں کی زندگی کے روشن پہلو پر تاریکی کے پردے پڑ گئے، موجودہ دور کے اہل قلم کو اسی تاریک پردے کو اٹھانا ہے، ظاہر ہے کہ زیر نظر کتاب محض ایک نصاب کی تاریخ ہے تحقیق و تدقیق کا کوئی مخزن نہیں، لیکن تھوڑی سی محنت سے اس کتاب میں بھی التمش کی درویشی و خدا ترسی، ناصر الدین محمود کی نیک نفسی و پرہیزگاری، غیاث الدین تغلق اور فیروز شاہ تغلق کی حق شناسی و شریعت پسندی، اور عالمگیر کی دینداری و مذہب نوازی کی تفصیل لکھ کر طلبہ کے مذہبی شعور کو بیدار کیا جا سکتا تھا، اسی طرح مفتوحین کے ساتھ محمد بن قاسم کی صلح کل پالیسی، مذہب و ملت کی تفریق کے بغیر شیر شاہ کی رعیت پروری، ہندوؤں کے ساتھ ہمایوں کی نرمی و شرافت، اکبر کی محبت و مساوات، جہانگیر کی دوستی و مروت کی حکایتیں بیان کر کے طلبہ کو سیاسی رواداری کا سبق پڑھایا جا سکتا تھا، محمود غزنوی، بلبن اور جہانگیر کی انصاف پسندی اور عدل گستری کے قصے سنا کر طلبہ کے اخلاق و کردار کا معیار اونچا کیا جا سکتا تھا، بلبن کی سطوت و عظمت، علاء الدین خلجی کے جلال و جبروت، اور شاہجہان کی حشمت و شوکت کی تصویر کھینچ کر فاضل مؤلف طلبہ کو حکمرانی کے رموز و نکات سے آگاہ کر سکتے تھے،

مسلمان حکمرانوں میں عیوب و نقائص ضرور تھے، کسی کو اس سے انکار نہیں لیکن اگر ان کے عیوب و نقائص ہی کا پلہ بھاری رہتا تو ظاہر ہے کہ ان کی حکومت چند دنوں سے زیادہ قائم نہیں رہ سکتی تھی، قومی حیثیت سے تقریباً وہ ایک ہزار سال تک اس ملک کے سیاہ و سپید کے مالک رہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی حکومت میں اچھائیاں زیادہ تھیں اور برائیاں کم، لیکن دو سو سال تک انگریز مورخین اور ان کے مقلدین ان کی اچھائیوں کو حذف کر کے ان کی برائیوں کو اچھالتے رہے، مگر اب جب کہ بھارت میں ایک نیا دور شروع ہوا ہے، اور پاکستان میں ایک نئی مملکت کی بنا ڈالی گئی ہے، تاریخ کو ایک نئے زاویہ سے لکھنے اور پڑھانے کی ضرورت ہے، یہ کوئی ضروری نہیں کہ یورپین مورخوں نے

جاسن وڈ مائم کا جو اپنا معیار قائم کر رکھا ہو، اسی کے مطابق ہم بھی اپنے اسلاف کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کریں، ہمارے پاس خود ہی ایک پیمانہ ہے، اسی کے مطابق ہم اپنی تاریخ لکھیں،

ممکن ہے کہ ہندوستان کے مسلمان حکمران اسلام کے صحیح اور سچے نمائندہ نہ ہوں، لیکن پھر بھی تقریباً ایک ہزار سال کی مدت میں ان میں سے بعض سلاطین بڑے ہی اولو العزم اور جانباز فاتح تھے، بعض بڑے ہی ہوشمند اور بیدار مغز سیاست دان تھے، بعض بڑے ہی متقی اور عابد تھے اور بعض بڑے ہی علم دوست اور ہنر پرور تھے، ان تمام حکمرانوں کی مجموعی خوبیوں کی وجہ سے ہندوستان کی سیاست، معاشرت، تہذیب، تمدن کو بڑا فروغ ہوا، بعض رند مشرب اور عیش پسند سلاطین بھی تھے، لیکن ان میں بھی کچھ نہ کچھ خوبیاں ضرور تھیں، اگر ان رنگا رنگ حکمرانوں کے تمام اوصاف کو سلیقہ اور محنت سے جمع کرنے کی کوشش کی جائے تو ہمارے ماضی کی تاریخ بلاشبہ جگمگا اٹھے گی، اور یہ کام لائق مؤلف ہی جیسے وسیع النظر اور شگفتہ اہل قلم کے ذریعہ انجام پا سکتا ہے، بشرطیکہ وہ پورے انہماک کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوں،

معلوم نہیں فاضل مؤلف نے اپنی کتاب میں مسلمانوں کے فن تعمیر کا ذکر صرف جا بجا چند سطروں میں کرنا کیوں پسند کیا، حالانکہ یہ اس دور کی تاریخ کا بڑا اہم اور شاندار موضوع ہے، اس کے لئے تو علٰحدہ باب قائم کرنے کی ضرورت تھی، اسی طرح اس دور کی بادشاہت کی نظری و عملی نوعیت، وزراء کی حیثیت، فوجی و حربی نظام، تعلیمی نظام، عدل و احتساب کے طریقے، رفاہ عام کے محکمے، صوبوں کے نظام حکومت وغیرہ پر علٰحدہ علٰحدہ عنوانات قائم کر کے، ان کا مرقع پیش کیا جا سکتا تھا، ان تمام موضوعات پر کافی تحقیقات بھی ہو چکی ہیں، ظاہر ہے کہ ان کی تفصیلات ہمارے فاضل مؤلف کی نظروں سے ضرور گذری ہوں گی، شاید طوالت کے خیال سے ان کو پھیلا کر لکھنا پسند نہیں فرمایا ہو، لیکن طوالت سے بچنے میں ہماری تاریخ کا محض ایک دھندلا سا خاکہ نظر آئے اور اس کے ساتھ ساتھ مضرت رساں نتائج پیدا ہونے کا خطرہ ہو تو پھر تھوڑی سی

طوالت ہی گوارا کر لینا مناسب ہے، طلبہ کے ذہن و دماغ کو تاریکی مین رکھنے سے کہین زیادہ بہتر ہوا، ایک ضخیم کتاب لکھ کر کئی سال مین تدریجاً ختم کرائی جائے،

میرے ان معروضات سے شاید مؤلف کو شکایت پیدا ہو کہ اُن کی کتاب مین ضرورت سے زیادہ مسائل کی توقعات خواہ مخواہ قائم کر لی گئی ہین، جن کو عمل مین لانا آسان نہ تھا، ممکن ہے انھون نے جیسی کتاب لکھی ہے، ویسی ہی کی طلب اُن کے ملک مین ہو، لیکن اس عاجز راقم کے ذہن مین بعض باتین ایسی تھین، جن کا اظہار محض نیک نیتی سے اس لئے کیا گیا ہے کہ اب جب کہ حالات کے ساتھ ذوق بھی بدل چکا ہے، تو نصاب مین مسلمان حکمرانون کی ایک ایسی تاریخ ہونی چاہیے جو اُن کے عہد کا واقعی ایک دلآویز اور دلکش مرقع ہوتا، تاکہ طلبہ کو اپنی گذشتہ تاریخ کی عظمت کا صحیح احساس پیدا ہو،

بزم صوفیہ

از

جناب ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی، صدر شعبۂ اسلامیات کلکتہ یونیورسٹی

اربابِ تصوف نے تاریخ اسلام کے ہر دور مین ہر اسلامی ملک کی تاریخ مین ایک خاص شاندار حصہ لیا ہے، ان بزرگون نے اگر ایک طرف اپنی زندگی کی سادگی، اپنے عجز وانکسار، اپنے تحمل و تواضع، اپنی محبت و مودت کی ہمہ گیری، اور اپنے دلون کی وسعت اور فراخی سے غربا کے لئے سکون، مجبورون کے لئے راحت اور ستم رسیدہ بندگانِ خدا کے لئے صبر و شکر کے سامان بہم پہنچائے، تو دوسری طرف جاہ و ثروت سے اپنی بے تعلقی اور مملکت و سلطنت سے اپنی بے تعلقی، بلکہ بیزاری سے امرا و سلاطین کے نشۂ امارت و حکومت کو توڑا، اور ظلم و استبداد کو روکا، ان بزرگون کے سوانحِ حیات آج بھی بہتیرے ٹوٹے ہوئے دلون کو جوڑنے مین اکسیر کا کام دیتے ہین، جس درد کی دوا ہمارے بڑے بڑے

لیڈرون کی لمبی لمبی تقریرون مین نہین ملتی، اس کا علاج ان آسودگانِ خواب کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی حکایتون مین کثرت سے ملتا ہے،

ہندوستان کے انھی اربابِ تصوف مین سے ۱۹ اکابر و مشاہیر کے سوانحِ حیات سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے ان حضرات کے تالیفات، ملفوظات اور مکتوبات مین سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اور دوسری کتب سیر و تاریخ مین سے چُن چُن کر اپنی کتاب "بزم صوفیہ" مین جمع کر دیے ہین،

صباح الدین صاحب تاریخ کے ماہر اور فنِ تالیف و تصنیف مین مشاق ہین، بزم صوفیہ کی تصنیف مین اپنی قابلیت سے انھون نے پورا فائدہ اٹھایا ہے، اور کتاب کے موضوع پر مختلف ماخذون مین جو کچھ انکو مل سکا، اس کو نہایت سلیقہ سے اکٹھا کر دیا ہے،

کتاب کا موضوع مشکل ہے، اور اس کے ماخذ مین معتبر اور غیر معتبر ہر طرح کی روایتین داخل ہین، ایک تو فنِ سیر کی کتابون مین عموماً ہر طرح کی رطب و یابس روایتین داخل کر دی گئی ہین، دوسرے صوفیۂ کرام کی سیرتین، اور حالاتِ زندگی عموماً ان بزرگون کے مریدون اور عقیدتمندون نے لکھے ہین، اس لئے ان کتابون مین کراماتِ اولیار کی عجیب عجیب حکایتین نظر آتی ہین، ان بزرگون کے ملفوظات بھی زیادہ تر ان مریدون نے ہی جمع کئے ہین، اس لئے ان کتابون مین بھی جو عام طور پر غلطی سے ان بزرگون کی ہی تحریرین مانی جاتی ہین، مریدون اور عقیدتمندون کے خیالات کثرت سے پائے جاتے ہین، جو کچھ خود ان مقدس حضرات نے سپرد قلم کیا ہے، اس مین بھی ان بزرگون کے خاص خاص روحانی، اور جذباتی حالات کا بیان کثرت سے پایا جاتا ہے، اور ان حالات کو تو ایسا ہی آدمی سمجھ سکتا ہے، جس کو خود ان روحانی کیفیات کا تجربہ ہوا ہو، عوام الناس جن مین بہتیرے علمار بھی داخل ہین، ان رموز کے سمجھنے سے قاصر رہتے ہین، یہی وجہ ہے کہ حضرت شیخ محی الدین ابن العربی کی تحریرون کے متعلق علمار کی ایک بڑی جماعت، چہ میگوئیان اور موشگافیان کرتی ہوئی نظر آتی ہے،

سید صباح الدین صاحب نے جن ماخذون کو استعمال کیا ہے، ان سے ہر قسم کے مضامین تو اخذ کرلئے ہین، لیکن خود ان ماخذون کے قابل اعتبار ہونے پر کوئی بحث نہین کی ہے، مثال کے طور پر حضرت مخدوم سید محمد اشرف جہانگیر سمنانی کی لطائفِ اشرفی کو لیجئے، اس کتاب سے بزم صوفیہ کے مؤلف نے بہتیری چیزین اخذ کی ہین، لیکن یہ کہین نہین بتایا، کہ یہ کتاب کہان تک قابلِ اعتبار ہے، حالانکہ انگلستان کے مشہور مستشرق ڈاکٹر ریو نے اپنی فہرست مخطوطاتِ فارسیہ موجودہ متحف برطانیہ مین لکھا ہے کہ یہ کتاب تاریخی تناقض (Anachronism) سے بھری پڑی ہے، لہذا میرے خیال مین لائق مؤلف کا فرض تھا کہ اس مسئلہ پر کچھ روشنی ڈالتے،

اصل یہ ہے کہ یہ کتاب خود مخدوم موصوف نے لکھی ہی نہ تھی، بلکہ اُن کے ایک عقیدتمند مرید نے ان سے جو سُنا تھا، اس کو سپرد قلم کر دیا تھا،

اس کے علاوہ مخدوم صاحب نے اپنے زمانہ سیر و سیاحت مین بہتیرے علماء و فضلاء اور اولیاء اللہ سے ملاقاتین کی تھین، جن کا ذکر لطائف اشرفی مین کیا گیا ہے، ان مین بعض ایسی بزرگ ہستیون کا بھی ذکر آگیا ہے جو حضرت مخدوم سے قبل ہی واصل بحق ہو چکی تھین، اب ان بزرگون کا ذکر ممکن ہے کہ کاتب صاحب نے غلط فہمی سے کیا ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت مخدوم نے لقاے روحانی کا ذکر کیا ہو، جس کو کاتب صاحب نے لقاے جسمانی سمجھا ہو،

حضرت مخدوم موصوف کی ایک اور کتاب مکتوباتِ اشرفی ہے جس مین وہ خطوط جو حضرت نے مختلف سلاطین، امراء، فضلاء، علماء، اور اولیاء اللہ کو مختلف وقتون مین لکھے تھے، جمع کر دیئے گئے، ظاہر ہے کہ یہ خود حضرت کی تحریرین ہین، ان مکتوبات مین بہتیرے واقعاتِ حاضرہ پر اظہار رائے کیا گیا ہے، اور متعدد مسائل تصوف پر طول و طویل بحثین بھی اس مین ملتی ہین، مؤلف بزم صوفیہ نے اس کتاب کا ذکر تو کیا ہے لیکن یہ کتاب دیکھی نہین ہے، حالانکہ اس کے متعدد قلمی نسخے ہندوستان مین موجود ہین،

اس کا ایک نسخہ حضرت سید شاہ شاہد علی صاحب سبز پوش گورکھپور کے کتبخانہ مین بھی ہے، مین نے اس کے بڑے حصے کا مطالعہ کیا ہے، کتاب تاریخی، اور علمی حیثیت سے بہت اہم ہے، مؤلف بزم صوفیہ کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے تھا،

مؤلف کو اپنے مقدمہ مین تمام اہم ماخذون کا ذکر کرکے اُن کے معتبر اور غیر معتبر ہونے پر بحث کرنا چاہئے تھا، اُن کو یہ بھی بتانا تھا کہ ان کتابون کی تاریخی اہمیت کیا ہے، اور عام سیاسی کتب تاریخی اور ان کتابون کے مقصد تالیف مین کیا فرق ہے، اور یہ تمام ماخذ ہندوستان کی سماجی اور اخلاقی تاریخ پر کیا روشنی ڈالتی ہین،

صوفیہ کرام کے حالات لکھنے مین بھی نقادانہ حیثیت سے جزئیات پر بھی نگاہ رکھنے کی ضرورت تھی کتاب مین کرامات کا ذکر نہین ہے، اُن کے ذکر کرنے مین میرے خیال مین کوئی مضائقہ نہ تھا، بشرطیکہ ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیا جاتا کہ ان قصے کہانیون مین کون سے اخلاقی اور سماجی راز مخفی ہین،

ان باتون کے باوجود بزم صوفیہ، میرے خیال مین اردو ادب مین ایک اہم اضافہ ہے، اس کا مطالعہ ہر شخص کے لئے مفید ہوگا، بہتیرے شکستہ دل انسان اس مین اپنے درد کی دوا پائین گے، موجودہ پر آشوب زمانہ مین اس کا مطالعہ خاص طور پر روح افزا اور سکون بخش ثابت ہوگا، سید صباح الدین صاحب اردو خوان طبقہ کے شکریہ کے مستحق ہین کہ انھون نے بڑی دیدہ ریزی کرکے ایسی کتاب اردو دان پبلک کے سامنے پیش کی،

فیہ ما فیہ

ملفوظات مولانا روم جو ایک نایاب کتاب تھی، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے مختلف نسخون سے مقابلہ کرکے اس کو مرتب کیا، اور معارف پریس اعظم گڈہ مین چھپوایا،

قیمت :- عار

"منیجر"

ادبیات

بھارت کے مسلمان

از

جناب جگن ناتھ صاحب آزاد

"مذکورۂ بالا نظم جس اخلاص سے لکھی گئی ہے، اور جن شریفانہ اور اسلامی جذبات پر مشتمل ہے، وہ اس کا ثبوت ہے کہ تعصب و تنگ نظری کے اس تاریک دور میں بھی انسانیت کی شمع گل نہیں ہو گئی ہے، اس نظم کی قدر و قیمت اس لئے اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، کہ اس کا لکھنے والا گذشتہ انقلاب کا ستایا ہوا مغربی پنجاب کا ایک بے خانماں ہندو ہے، یہ نظم اس لائق ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی نگاہوں سے گذرے، اس لئے اس کو اخبار الجمعیۃ سے نقل کیا جاتا ہے، ہم کو امید ہے کہ انسانی اخوت و محبت کی اس آواز کا جواب پاکستان سے بھی دیا جائے گا، "م"

اس دور میں تو کیوں ہے پریشان و ہراسان

کیا بات ہے کیوں ہے متزلزل ترا ایمان

دانش کدۂ دہر کی اے شمع فروزان

اے مطلع تہذیب کے خورشید درخشان

حیرت ہے گھٹاؤں سے ترا نور ہو ترساں

بھارت کے مسلمان!

تو درد محبت کا طلب گار ازل سے

تو مہر و مروت کا پرستار ازل سے

تو محرم ہر لذت اسرار ازل سے

اور تیرا رعنائی افکار ازل سے

رعنائی افکار کو کر پھر سے غزلخوان

بھارت کے مسلمان!

ہرگز نہ بھلا میر کا غالب کا ترانہ

بن جائے کہیں تیری حقیقت نہ فسانہ

نزاکت فن گو تو ہے درکار بہانہ

تاراج نہ ہو قاسم و سید کا خزانہ

اے قاسم و سید کے خزانے کے نگہبان

بھارت کے مسلمان!

حافظ کے ترنم کو بسا قلب و نظر میں

رومی کے تفکر کو سجا قلب و نظر میں

سعدی کے تکلم کو بٹھا قلب و نظر میں

دے نغمۂ خیام کو جا قلب و نظر میں

یہ کر کہ ہو پھر ہند کی دنیا میں پرافشان

بھارت کے مسلمان!

طوفان میں تو ڈھونڈ رہا ہے جو کنارا

امواج کا کر دیدۂ باطن سے نظارا

ممکن ہے کہ ہر موج نظر کو ہو گوارا

ممکن ہے کہ ہر موج بنے تیرا سہارا

ممکن ہے کہ ساحل ہو پس پردۂ طوفان

بھارت کے مسلمان!

"مانند صبا خیز و وزیدن دگر آموز

اندر دل غنچہ خزیدن دگر آموز

در انجمن شوق طپیدن دگر آموز

نومید مشو نالہ کشیدن دگر آموز"

اے تو کہ لئے دل میں ہے فریادیتان

بھارت کے مسلمان!

ظاہر کی محبت سے مروت سے گذر جا

باطن کی عداوت سے کدورت سے گذر جا

بے کار و دل آزار قیادت سے گذر جا

اس دور کی بوسیدہ سیاست سے گذر جا

اور عزم سے پھر تھام ذرا دامن ایمان

بھارت کے مسلمان!

اسلام کی تعلیم سے بیگانہ ہوا تو

نامحرم ہر جرأت رندانہ ہوا تو

آبادی ہر بزم تھا ویرانہ ہوا تو

تو ایک حقیقت تھا اب افسانہ ہوا تو

ممکن ہو تو پھر ڈھونڈ گنوائے ہوئے سامان

بھارت کے مسلمان!

اجمیر کی درگاہِ معلیٰ تری جاگیر
محبوبِ الٰہی کی زمین پر تری تنویر
ذرات میں کلیر کے فروزاں تری تصویر
ہانسی کی فضاؤں میں ترے کیف کی تاثیر
سرہند کی مٹی ہے ترے دم سے فروزاں
بھارت کے مسلمان!

ہر ذرۂ دہلی ہے تری ضو سے منور
پنجاب کی مستی اثرِ جذبِ قلندر
گنگوہ کی تقدیس ہے قدوس سراسر
پٹنے کی زمین نکہتِ خواجہ سے معطر
مدراس کی مٹی میں نہاں تاجِ شہیداں
بھارت کے مسلمان!

بسطامی و تبریزی و معرّی و غزالی
جس علم کی جس فقر کی دنیا کے تھے والی
حیرت ہے تو اب ہے اسی دنیا میں سوالی
ہے گوشۂ بستی میں تری ہمت عالی
افسوس صد افسوس تری تنگیٔ داماں
بھارت کے مسلمان!

مذہب جسے کہتے ہیں وہ کچھ اور ہے پیارے
نفرت سے پرے اس کا ہر اک طور ہے پیارے
مذہب پہ تعصب تو بڑا جور ہے پیارے
عقل و خرد و علم کا یہ دور ہے پیارے
اس دور میں مذہب کی صداقت ہو نمایاں
بھارت کے مسلمان!

اسلام تو مہر اور محبت کا بیان ہے
اخلاص کی روداد، مروت کا بیان ہے
ہر شعبۂ ہستی میں صداقت کا بیان ہے
اک زندہ و پائندہ حقیقت کا بیان ہے
کیوں دل میں ترے ہو نہ حقیقت یہ فروزاں
بھارت کے مسلمان!

اسلام کی تعلیم فراموش ہوئی کیوں
انسان کی تعلیم فراموش ہوئی کیوں
افراد کی تنظیم فراموش ہوئی کیوں
اخلاص کی اقلیم فراموش ہوئی کیوں
حیرت میں ہوں میں دیکھ کے یہ عالمِ نسیاں
بھارت کے مسلمان!

ماحول کی ہو تازہ ہوا تجھ کو گوارا

درکار ہے تہذیب کو پھر تیرا سہارا
کر آج نئے رنگ سے دنیا کا نظارا
چمکے گا پھر اک بار ترے بخت کا تارا
ہو جائے گی تاریکیٔ ماحول گریزاں
بھارت کے مسلمان!

تاثر

از سید ضامن حسین صاحب گویا جہان آبادی

زخم کس سے دکھائے جاتے ہیں — ہم یونہی مسکرائے جاتے ہیں
ناز بے پردہ حریمِ ناز — کس سے جلوے چھپائے جاتے ہیں
راز ہم ہیں تو راز ہے ہر شے — اپنے معنی بتائے جاتے ہیں
راہِ ماضی کے سب نقوش کہاں — کچھ ستاروں میں پائے جاتے ہیں
خلوت و انجمن میں فرق نہیں — دونوں پردے اٹھائے جاتے ہیں
اشکِ رنگین و سجدہ ریزی کیا — راہ اُن کی سجائے جاتے ہیں
کون ہے ہر خموش آنسو میں — کچھ اشارے سکھائے جاتے ہیں
بجلیاں گرتی ہیں نظاروں پر — یوں بھی پردے اٹھائے جاتے ہیں
سنگِ در پہ رہے گا نقشِ جبیں — یاد اپنی دلائے جاتے ہیں
اشک پوچھوں کہ عرضِ حال کروں — ملتفت تو وہ پائے جاتے ہیں
عشق مجبور ہے نہ ہے مختار — دونوں پہلو بتائے جاتے ہیں
غم کے طوفان بڑھا کے دنیا میں — پار بیڑے لگائے جاتے ہیں
دل کا ہر نقش ہے زبانِ گویا — کیا کہیں کیا سنائے جاتے ہیں

مطبوعاتِ جدیدہ

خطباتِ جمعہ وخطباتِ موعظہ جلد اوّل — مؤلفہ جناب مولانا ابوالناصر ذاکر حسن صاحب مظاہری، تقطیع بڑی ضخامت ۲۵۹ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت معمولی قیمت مجلد عار، پتہ کتاب گھر نئے مسجد کراس بنگلور نمبرا

جمعہ کا خطبہ مخلوطاً عربی اور اردو مین پڑھنے کا مسئلہ مختلف فیہ ہے، مگر نماز جمعہ ہی کا ایک ایسا موقع ہوتا ہے جس کے ذریعہ بغیر کسی اہتمام کے مسلمانون کے کانون تک مذہبی مسائل اور دینی ضروریات کی باتین پہنچائی جاسکتی ہین، مگر سامعین عموماً عربی زبان سے ناواقف ہوتے ہین، ان دونون مقاصد کے حصول کے لئے فاضل مؤلف نے عربی کے یہ خطبات اور اردو کے مواعظ تالیف کئے ہین، اس جلد مین محرم سے لے کر جمادی الثانی تک ہر مہینہ کے پانچ پانچ عربی کے خطبے اور اسی قدر اردو کے مواعظ تالیف کئے ہین، جن کو عربی کے خطبہ سے پہلے یا نماز جمعہ کے بعد پڑھ کر سُنایا جاسکتا ہے، اس طرح خطبہ کے لئے عربی زبان کی شرط بھی پوری ہوجاتی ہے، اور مسلمانون کی اصلاح اور وعظ وتذکیر کا مقصد بھی حاصل ہوجاتا ہے، عربی کے خطبون مین ہر مہینہ کے مناسب مسائل کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے، اور اردو کے مواعظ مین عقائد وعبادات سے لے کر معاملات واخلاق تک دین کے ان تمام ضروری مسائل اور اوامر ونواہی کو بیان کیا گیا ہے، جن کا جاننا ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے، انداز بیان مؤثر و دلنشین ہے، خطبات کے شروع مین ایک مبسوط مقدمہ ہے، جس مین مساجد کے ائمہ اُن کے اوقاف

متولیون کے متعلق ضروری مسائل اور وعظ وتذکیر کے مؤثر طریقے تحریر کئے گئے ہین، اور فقہی حیثیت سے خطبۂ جمعہ کی زبان کی تحقیق کی گئی ہے، اس قسم کے اور خطبات بھی مرتب کئے گئے ہین، مگر ان خطبات مین بڑی جامعیت ہے اور وہ مسلمانون کی جملہ دینی ضروریات پر حاوی ہین، اس لئے ائمہ مساجد کو اُن سے فائدہ اٹھانا چاہئے،

مضمون نگاری جلد اوّل — از جناب اخلاق صاحب دہلوی تقطیع اوسط ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد سے ر غیر مجلد عیر، پتہ:- کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار جامع مسجد دہلی نمبر۶،

یہ کتاب مصنف نے فنِ مضمون نگاری پر لکھی ہے، مضمون نگاری کا تعلق زیادہ تر علمی اور ادبی استعداد اور مشق ومہارت سے ہے، تاہم ایک حد تک بعض امور کا لحاظ رکھنے سے مضمون نگاری کی مشق ومہارت مین سہولت پیدا ہوتی، اور اس کی پختگی مین مدد ملتی ہے، لائق مصنف نے جو خود ایک کہنہ مشق ادیب ہین، اپنے ذاتی تجربات اور فنی حیثیت سے اس کتاب مین مضمون نگاری کے اصول وقواعد اور ظاہری ومعنوی حیثیت سے کامیاب مضمون نگاری کے طریقے بڑی تفصیل کے ساتھ تحریر کئے ہین، اور اس محدود موضوع پر معلومات کا کافی ذخیرہ جمع کر دیا ہے، اور ادبی بصیرت کے لئے ادیبانہ اور شاعرانہ نظم ونثر کے نمونے اور ان سے متعلق ادبی نکات بھی تحریر کر دیئے ہین، اور کتاب کے آخر مین دلی کی قدیم علمی وتاریخی یادگارون مین مولوی امام بخش صہبائی قدیم عربی اور موجودہ دلی کالج اور دلی کی قدیم تاریخی آبادی عرب سرائے کی تاریخ، اس کی عمارتون اور اس کے ساکنین کے حالات بھی لکھدیئے ہین، جس سے اس کتاب کی افادیت زیادہ بڑھ گئی ہے، اور اوس کے خشک مضمون مین بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی ہے،

مقالاتِ صارم — از جناب مولوی عبدالصمد صاحب صارم فاضل جامع ازہر، پروفیسر عربی یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور، تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد عہر، غیر مجلد عہر، پتہ حکیم عبدالحفیظ صاحب صدیقی، ادارہ علمیہ وسنی رام روڈ انارکلی لاہور،

یہ کتاب مصنف کے مضامین اور تلخیصات و تراجم کا مجموعہ ہے مضامین میں اسلامی نظریۂ تعلیم، خوارج، قید خانے اور سزائیں، عورت، اور جمع قرآن پر ایک نظر، اور تلخیص و تراجم میں مجرم بچے، قرون وسطیٰ میں نظام رسل و رسائل، بردی کی چیونٹیاں ہیں، مصنف سے جس معیار کے مضامین کی توقع تھی، وہ اس مجموعہ سے پوری نہیں ہوتی، ان کے بعض طبعزاد تو کسی قدر غنیمت ہیں، مگر تلخیصات و تراجم تو بہت سطحی ہیں، مصنف کی تحریر میں بھی ان کی ہندیت پر اظریت غالب نظر آتی ہے، اور مضامین میں جابجا نامانوس عربی الفاظ بلکہ پورے پورے عربی فقرے ذوق پر بہت گران گذرتے ہیں، یہ انداز تحریر اردو کے لئے بالکل بے جوڑ ہے، ان خامیوں کے باوجود یہ مجموعہ فائدہ سے خالی نہیں ہے،

ترجمانِ اسرار، از آنریبل جسٹس عبدالرحمن جج ہائی کورٹ لاہور، تقطیع بڑی، ضخامت ۱۲۴ صفحے، کاغذ نفیس، ٹائپ روشن و دیدہ زیب قیمت مجلد سے، پتہ مکتبہ کاروان ایبک روڈ لاہور،

ترجمان اسرار سر اقبال مرحوم کی شہرۂ آفاق مثنوی اسرار خودی کا منظوم اردو ترجمہ ہے، ترجمہ میں نثر کے ادبی محاسن کو قائم رکھنا مشکل ہے، اور نظم کی خوبیوں کا تو اور بھی دشوار ہے، اس قسم کے تراجم کی بڑی کامیابی یہی ہے کہ اصل کے مفہوم و منشا میں فرق نہ آنے پائے، اور ترجمہ کی زبان میں سلاست قائم رہے، اس لحاظ سے یہ ترجمہ کامیاب ہے، اور اصل کا مفہوم و منشا پوری طرح ادا ہو گیا ہے، اور فارسی زبان کی حلاوت و فصاحت، لطافت ادا، الفاظ اور ترکیبوں کے حسن سے قطع نظر جس کا قائم رکھنا اردو میں ممکن نہ تھا، نفس ترجمہ میں بڑی حد تک سلاست و روانی قائم ہے، اور بیشتر اشعار ترجمہ نہیں معلوم ہوتے، کتاب کے شروع میں اقبالیات کے سب سے بڑے ماہر اور شارح ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب کا فاضلانہ مقدمہ ہے، جس میں اقبال کے فلسفۂ خودی اور ان کی تعلیمات پر مبصرانہ نگاہ ڈالی گئی ہے، فاضل مترجم اس حیثیت سے لائق مبارکباد ہیں کہ اپنے عہد کی مشغولیتوں اور خشک قانونی موشگافیوں کے باوجود ادبی مذاق قائم رکھا، ایک مفید علمی و ادبی خدمت بھی انجام دیدی، اس ترجمہ سے اردو ادب کے ذخیرہ میں ایک بیش قیمت اضافہ ہوا،

اطمینانِ قلب از جناب سید اسد الرحمن صاحب قدسی تقطیع اوسط ضخامت ۱۰۰ صفحے کاغذ و کتابت نفیس، قیمت مجلد عہ، پتہ:- گوشۂ ادب لاہور،

عام طور سے ناآشنائے حقیقت مروجہ تصوف و طریقت پر جو کتابیں لکھتے ہیں، ان کو شریعت اور کتاب و سنت سے بہت کم علاقہ ہوتا ہے، یا کم از کم وہ رطب و یابس سے خالی نہیں ہوتیں، مگر مذکورۂ بالا کتاب اس سے مستثنیٰ ہے، اس میں آیاتِ قرآنی کی روشنی میں حقیقی اسلامی تصوف کی جو شریعت کی روح اور اس کا مغز ہے، وضاحت کی گئی ہے، اور اس کے اجزاء و عناصر، لوازم و شرائط، اس کے حصول کے ذرائع و وسائل، اعمال و مجاہدات اور اوراد و وظائف اور ادعیۂ ماثورہ کو اختصار و جامعیت کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے، کتاب تصوف کا مذاق رکھنے والوں کے مطالعہ کے لائق ہے،

کاروان و منزل از جناب گوپی ناتھ امن لکھنوی تقطیع اوسط ضخامت ۲۲۴ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عار، پتہ سنگم گھر اردو بازار جامع مسجد دہلی،

کاروان و منزل مصنف کے کلام کا مجموعہ ہے، وہ صرف ایک کہنہ مشق شاعر ہی نہیں بلکہ گاندھی جی کے سچے مقلد اور قوم و وطن کے پرانے خادم بھی ہیں ۱۹۲۰ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں برابر شریک رہے، اور اس راہ میں قید و بند کی مصیبتیں بھی جھیلیں، ان کی اس زندگی، اور ان کے سیاسی عقائد و خیالات کا عکس ان کی شاعری میں بھی ہے، چنانچہ اس مجموعہ کا بڑا حصہ قومی و سیاسی نظموں پر مشتمل ہے، اور ان میں تحریک آزادی کے مختلف مراحل، اس کے مختلف رخوں، اور اس سے متعلق متفرق حالات و واقعات کی تصویریں ہیں، اور اس حیثیت سے یہ مجموعہ ایک محب وطن کے جذبات و تاثرات کا دلچسپ مرقع ہے، ان کے علاوہ مختلف موضوعوں پر کچھ نظمیں اور غزلیں بھی ہیں، مگر ان کا طرز بھی

عام رنگ سے مختلف ہے، اور محض خیال آرائی کے بجائے ان مین بیشتر کسی نہ کسی حقیقت کی ترجمانی

گئی ہے، خاص تغزل کا رنگ بھی ستھرا ہے، مجموعی حیثیت سے یہ مجموعہ مصنف کی کہنہ مشقی کا نمونہ

ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے،

اقوال اشرف مرتبہ جناب پروفیسر عبد المنان صاحب بیدل تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۶ صفحے، کاغذ

کتابت وطباعت بہتر قیمت ۸ر پتہ اقبال بک ڈپو پٹنہ،

حضرت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات، دینی واخلاقی فوائد، اور دنیوی واخروی فلاح

سعادت کا گنجینہ ہین، لائق مرتب نے اس کتاب مین مذہبی وروحانی تعلیمات ظاہری وباطنی ومعاشرتی

اصلاح اور عارفانہ حقائق ومعارف وغیرہ سے متعلق حضرت مولانا کے تین سو منتخب ملفوظات

ہین، یہ مجموعہ اگرچہ مختصر ہے، لیکن فائدہ کے لحاظ سے ضخیم کتابون پر فوقیت رکھتا ہے، کتاب کے شروع

مین حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے مختصر سوانح اور اُن کے

اور کارنامون پر تبصرہ ہے،

رسولِ عربی از جناب سید فرید الوحیدی صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۰ صفحے، کاغذ کتابت

وطباعت بہتر قیمت ۱۲ر پتہ قومی کتاب گھر دیوبند،

اس کتابچہ مین جیساکہ اس کے نام سے ظاہر ہے بچون کے لئے آسان زبان مین سوانح نبوی

سیرت پاک کے مختصر حالات تحریر کئے گئے ہین، اور ہر سبق کے متعلق مشقی سوالات بھی دیدئے گئے

ہین، کتاب بچون کے پڑھانے کے لائق ہے،

"م"

جلد ۶۹ ماہ جمادی الثانی ۱۳۷۱ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۵۲ء عدد ۳

مضامین